مُسلمانوں کی آ[illegible]

میں اور اس کی تشکیل ملک ی
یہ ہے کہ وہ قوم کے بچوں کو از
نیہ ر و ح پیدا کر

مقالہ

اُردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
(اپریل سنہ ۳۳ء)

از

مولنا سید سلیمان ندوی

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

(مطبوعہ جید برقی پریس بلیماران دہلی)

دیباچہ

جناب مولانا سید سلیمان ندوی کے خیالات مسلمانوں کی آیندہ تعلیم کے متعلق خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ اُن چند ارباب فکر میں سے ہیں جو تعلیم کو محض اقتصادی فوائد کا وسیلہ یا شخصی ترقی کا ذریعہ نہیں سمجھتے، بلکہ اسے حیات ملی کا ایک اہم وظیفہ قرار دیتے ہیں، اور اس کی تشکیل ملک کی ضرورتوں اور مصلحتوں کے لحاظ سے کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے نزدیک "تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کے بچوں کو اُن کی زندگی کے قومی مقاصد کی تلقین اور تفہیم کرے اور ان کے اندر ان مقاصد کی تعینیت کی رُوح پیدا کر کے ان کو سراپا عمل بنائے" اور بہ قول آپ کے ہندوستان میں ہماری قومی زندگی کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱ - پیغام اسلام کی تعمیل حفاظت اور بقا۔

۲ - اس ملک کے لیے ایک عام جمہوری نظام حکومت کا قیام۔

۳ - اس عام ملکی جمہوریہ کے ماتحت خالص اسلامی کلچرل اٹانومی کا قیام۔

چنانچہ آپ کے خیال میں مسلمانوں کی آیندہ تعلیم ان مقاصد ثلاثہ کے سانچہ میں ڈھالی جانی چاہیے۔ اس اجمال کی تفصیل سید صاحب نے ایک متین اور محکم بحث میں، نہایت سادہ اور شگفتہ اسلوب سے کی ہے۔ اردو اکادمی کی خوش قسمتی ہے کہ اسے سید صاحب کے گراں بہا خیالات کو ملت اسلامی تک پہنچانے کا شرف حاصل ہوا۔ جناب ممدوح کا یہ لکچر جو ۱۱-اپریل ۳۳ء کو اکادمی کے جلسے میں پڑھا گیا تھا اور پھر رسالہ جامعہ میں چھپا تھا، اب علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ ہم آگے چل کر اور اہل نظر بزرگوں کے مقالے بھی اس موضوع پر حاصل کر سکیں گے اور انہیں اسی سلسلہ میں شائع کریں گے۔

سید عابد حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانوں کی آئندہ تعلیم

دوستان و عزیزان جامعہ! آج سے آدھی صدی پہلے مولانا شبلی مرحوم نے علیگڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسے میں "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" پر ایک مضمون پڑھا تھا جو نہایت مقبول ہوا تھا، اب آدھی صدی کے بعد ضرورت ہے کہ "مسلمانوں کی آئندہ تعلیم" کے مسئلے پر غور کیا جائے۔

اُسی زمانے میں سر سید مرحوم نے مسلمانوں کے انحطاط کا سبب اور اس کا علاج مسلمانوں کے اہل دماغ طبقے سے پوچھا تھا۔ بہت سے صاحبوں نے اس کا سبب جہالت اور اس کا علاج "تعلیم جدید" کو قرار دیا تھا۔ چنانچہ نصف صدی تک ہم نے اس فیصلے پر آنکھ بند کر کے عمل کیا اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہے۔ اب نصف صدی کے بعد پھر اس سوال کی ضرورت ہے کہ ہم کو کس قسم کی جدید تعلیم چاہیے۔ ان پچاس برسوں میں ہم نے صرف تعلیم تعلیم پکارا ہے اور ایک منٹ

کے لئے بھی اس پر غور نہیں کیا ہے کہ کیسی تعلیم؟

ترک موالات کی پہلی تحریک پہلا موقع تھا جس میں مسلمان نادانستہ طور سے اچانک اس موڑ پر پہنچ گئے جہاں ان کو اس کا فیصلہ ضروری ہو گیا ورنہ ہلاکت کا عمیق غار ان کے پاؤں کے نیچے تھا۔

اب یہ کوئی چھپا راز نہیں کہ تعلیم کے مسئلے پچاس برس پہلے کے مقابلے میں آج بالکل اور نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ پہلے جدید تعلیم کی ضرورت کا سب سے بڑا سبب سرکاری نوکریاں تھیں اور یہ یقین تھا کہ سرکاری نوکریوں کا دروازہ اسی کنجی سے کھلے گا، لیکن اب یہ مسئلہ اس صورت کے بجائے اس صورت میں ہے کہ نئی تعلیم کی ضرورت اس لئے ہے کہ "پیٹ" کا سوال اسی سے حل ہو گا۔ پچاس برس کے بعد مولانا حالی کا یہ طعنہ واقعے کی شکل میں ہمارے سامنے آگیا:۔

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اوسط ہر سال آگے بڑھ رہی ہے، آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ سنہ ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ سے مولانا شبلی نے اپنے وطن کے دوستوں کو مبارکباد بھیجی تھی کہ:

"اب کی پٹنہ محمڈن اسکول سے جو خاص مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے آٹھ لڑکے انٹرنس میں پاس ہوئے۔ جن میں پانچ مسلمان ہیں۔" (مکاتیب اول صفحہ ۴۳ طبع دوم)

اور اب یہ حال ہے کہ ہر سال انٹرنس اور میٹرک کیا، اس سے وہ چند گریجویٹ ہوئے ہیں، تاہم اب کیا مسلمانوں کا انحطاط کم ہو گیا اور وہ اب ترقی کر رہے ہیں؟ مولانا

مرحوم جب مولویوں کے مدرسوں کو چھوڑ کر علیگڑھ کالج آئے تھے تو وہاں کے طلبہ کو دیکھ کر حسب ذیل فقرے لکھے تھے:-

> ”یہاں آکر میرے خیالات مضبوط ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی تماشا گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دینگے لاحول ولا! وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی سمجھ نہیں سکتے۔

> ”سید صاحب (سر سید) نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے، صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔“

یہ خط ۱۸۸۳ء کا ہے جس کو اب پورے پچاس برس ہوئے۔ کیا تھوڑے تغیر کے ساتھ مسلمانوں کی جدید تعلیمی کیفیت یہی نہیں ہے؟ اصل یہ ہے کہ ہم نے جب جدید تعلیم کی اشاعت کا کام شروع کیا تو یہ سمجھے کہ نفس اے، بی، سی، ڈی ہماری کامیابیوں کے خزانے کی وہ کنجی ہے جو کبھی الف لیلہ کے علی بابا کو ہاتھ آ گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں ہم کو تعلیم کی حقیقت پر ایک لمحہ غور کرنا چاہئے۔

تعلیم تعلیم کے لفظی معنی سکھانے کے ہیں اور ہم اپنی زبان میں اس کے معنی سیکھنے سکھانے کے لیتے ہیں اور اس سے مراد پڑھنے اور لکھنے کا فن سیکھنا ہے اور آج کل اس کے معنی اس سے بھی زیادہ محدود ہیں یعنی انگریزی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کو ہم تعلیم کہتے ہیں ہم نے اب تک بار بار جب تعلیم کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد وہ سرکاری تعلیم لی ہے جو عام یونیورسٹیوں کے ماتحت دیجاتی ہے۔ دوسرے معنوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ لکھنے اور پڑھنے کا وہ ہنر یا پیشہ جو سرکاری نظام کے ماتحت سکھایا جاتا ہے۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنا چاہئے کہ کسی زبان کے چند حروف کو لکھنا اور ان کو پڑھ لینا اسی طرح کا ایک ہنر یا پیشہ ہے جس طرح نجاری، لوہاری، معماری اور دنیا کے اور پیشے ہیں۔ اگر کوئی اس حرف شناسی کے ہنر یا پیشے سے ناواقف ہے تو وہ اسی طرح مورد الزام ہو سکتا ہے جس طرح اس بات پر کہ وہ نجاری یا لوہاری یا معماری کا کام کیوں نہیں جانتا۔ موجودہ عہد سے پہلے کبھی کسی قوم کی ترقی اور تنزل کے مسئلے میں یہ چیز حدِ فاصل نہ تھی کہ اس میں فی صدی کتنے لوگ لکھنے اور پڑھنے کا پیشہ جانتے ہیں۔ کیا جب عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں کو شکست دے کر تاج و تخت پر قبضہ کیا وہ اپنی فیصدی تعلیم میں اپنے حریفوں سے بڑھ کر تھے؟ پھر جب انھیں عربوں کو سسلی میں نارمنوں نے اور اندلس میں اسپینیوں نے اور عراق و خراسان میں تاتاریوں نے شکست دی تو وہ فی صدی تعلیم میں ان نارمنوں اسپینیوں اور تاتاریوں سے کم تھے؟

خود ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک طرف سکھوں نے اور دوسری طرف مرہٹوں

نے دباکر ان کے نظام حکومت کو درہم برہم کر دیا تو سکھ اور مرہٹے اس وقت مسلمانوں سے فی صدی تعلیم میں بڑھ کر تھے؟

عزیزو! یہ "فی صدی" کا لفظ بھی ان منتروں میں ہے جن کو یورپ کے سیاسی ساحروں اور جادوگروں نے اپنی محکوم دنیا میں پھونک رکھا ہے اور اب ہم اس سے اتنے مسحور ہو گئے ہیں کہ ہر چیز کو اسی جادو کی ترازو سے تول کر جانچتے اور مانتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی قوت اور طاقت اس کی کمیت اور تعداد میں نہیں بلکہ اس کی کیفیت میں ہے۔ اگر کہیں صرف تعداد کی کثرت قوت کی مرادف ہوتی تو دو ہزار انگریز ۳۵ کروڑ ہندوستانیوں پر حکومت نہ کر سکتے اور نہ چار کروڑ جاپانی چالیس کروڑ چینیوں کو ہر قدم پر شکست دیتے چلے جاتے۔

قوم کی ترقی کا راز ان واقعات سے جو مشاہدات ہیں یہ راز خود بخود فاش ہو جاتا ہے کہ قوم کی ترقی کا راز فی صدی کا جادو نہیں بلکہ اس قوم کی قومیت کی معنوی روح اور زندگی قوت میں ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ قوم کے سامنے اس کی زندگی کا کوئی متفقہ اور متحدہ مقصد ہو، اس کے افراد اپنے ذاتی اور شخصی اغراض زندگی کے ساتھ من حیث المجموع ایک مشترک مقصود زندگی رکھتے ہوں جس کے حصول میں اس کا ہر چھوٹا بڑا، امیر غریب، عورت مرد غرض اس قوم کا ہر فرد پوری طرح مصروف و منہمک ہو اور اسی کی دھن میں اس کا جینا، مرنا، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا سب کچھ ہو اور ہر فرد کو یہ متحدہ مقصد اتنا عزیز ہو کہ جب کبھی اس کے سامنے اس کے ذاتی اور شخصی مقاصد اس کے

مشترکہ قومی مقصد سے متصادم ہوں تو بے تامل وہ اپنے تمام ذاتی مقاصد اور شخصی فوائد یہاں تک کہ خود اپنے وجود کو بھی اس پر نثار کردے۔

اٹھارھویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ میں جو واقعات پیش آئے ان کی تحلیل کیجئے تو اس راز سے خود بخود پردہ اٹھ جائے گا کہ ارکاٹ، سرنگاپٹم، پلاسی، بکسر، لکھنو اور دکّن میں مٹھی بھر انگریز ہندوستانی ریاستوں اور سلطنتوں کو اس آسانی سے کیوں کر توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے تھے۔ ایک طرف ایک متفقہ مقصد، متحد قوت اور منظم طاقت تھی، دوسری طرف منتشر اور پراگندہ اشخاص تھے جن میں سے ہر ایک کا مقصود الگ اور مطلب جدا تھا۔ کہیں اگر کوئی خاندان حکمراں تھا تو اس کے مختلف افراد بھی اس ریاست کی گدی اور مسند کے لئے باہم نبرد آزما تھے۔ آرکاٹ اور بنگال کی نوابیوں میں کیا یہی پیش نہیں آیا؟ حیدر علی اور ٹیپو جنھوں نے اپنے سامنے ایک مضبوط مقصد رکھا تھا، دیکھئے کہ ان کی یہ ذہنی مضبوطی ان کی جسمانی اور فوجی مضبوطی کی صورت میں کس طرح ڈھل گئی تھی اور اس وقت تک اس ”آہنی انسان“ کی قوت میں کمزوری نہیں آئی جب تک اس کے خاندان اور دربار میں وحدت کی جگہ شخصی مقاصد اور ذاتی منافع کی کثرت نہ آگئی۔ مذہب کی اصطلاح میں اسی ”ذہنی وحدتِ مقصد“ کا نام **ایمان** ہے جس کے بغیر کسی عمل کو اعتبار کا درجہ نہیں مل سکتا۔

اخلاق اور کیرکٹر کی مضبوطی جس کے بغیر کسی قوم کی معنوی زندگی کا وجود ہی نہیں ہو سکتا بہت کچھ اسی مقصدِ عزیز کی گراں بہا متاع کی حفاظت، بقا، ترقی اور استواری

کی خاطر وجود میں آتی ہے۔ ایثار، قربانی، عزم، استقلال، فیاضی، بہادری اور موت سے بے خوفی اسی طلسم کے روحانی اسرار ہیں۔ یہ حقیقت میں وہ جرس ہے جس کی آواز پر قوموں کے قافلے اپنے سفر طے کرتے ہیں اور کامیابی کی منزل کا پتہ لگاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہماری قوم کا اس دنیا میں کوئی بھی متحدہ مقصد ہے؟ اگر نہیں تو وہ قوم نہیں بلکہ جانوروں کا گلہ اور حیوانوں کا جھنڈ ہے۔

غور سے دیکھئے اسی ملک میں ہندو قوم آباد ہے۔ اس پر انقلابات کے بیسیوں دور گذر چکے ہیں، صدہا سال کی حیرانی و سرگردانی کے بعد اس نے اب اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دے لیا ہے، ان کے چھوٹے سے لے کر بڑے تک، نوکری پیشے سے لے کر آزادی طلب تک، غریبوں سے لے کر دولت مند مہاجنوں تک، محکوموں سے لے کر ان کے رئیسوں اور راجاؤں تک اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے کانگریسیوں سے لیکر خوشامدیوں تک ہر ایک نے اپنے سامنے کم از کم ایک متحدہ مقصد رکھ لیا ہے اور وہ مخالفت کی ہر قوت کو ٹھکرا کر اور عائق و مانع کی ہر دیوار کو ہٹا کر ہندو ذاتوں کو واحد قوم بنانا اور اس کے تمام پچھلے خصوصیات کے ساتھ اس کو اس ملک میں مستقل وجود بخشنا۔ اب اس قوم کی ہر کوشش ہر راہ سے اسی ایک منزلِ مقصود پر آ کر ختم ہوتی ہے، اس کے اہل سیاست کی کوشش یہ ہے کہ اس کو سیاسی خودمختاری اور اس ملک پر حکومت کی پوری ذمہ داری بخشیں۔ اہل تعلیم اس کو تعلیمی ذرائع سے حاصل کرنے کے لئے اس کے علم و فن کے پیمانے کو اونچا کر رہے ہیں، اصلاحِ معاشرت کے کارپرداز اس کو معاشرتی اور تمدنی طریقوں سے آگے بڑھا رہے ہیں۔

اہل دین اس کی دینی وحدت کی دھن میں ہیں، اہل علم اس کے معلومات کا خزانہ بھر رہے ہیں، اہل ادب اس کے لئے ایک واحد زبان کی تخلیق میں مصروف ہیں، انتہا یہ ہے کہ اس کے مجبور قیدی بھی ذاتوں کی تفریق کے خلاف حصول وحدت کے لئے پس دیوار لڑ رہے ہیں، الغرض "قومی وحدت" کی تشکیل کی جتنی صورتیں اور تدبیریں ہیں قوم کے مختلف کارکن اور کارفرما اپنے اپنے مذاق کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک کی تکمیل میں مصروف ہیں اور ان میں سے ہر ایک یہ جانتا ہے کہ دوسرا بھی دوسری راہ سے وہیں جا رہا ہے جہاں وہ خود جانا چاہتا ہے اس لئے راہ رو اور راہ بر باہم دست و گریباں نہیں ہیں۔

الغرض قوم کی زندگی کے لئے سب سے پہلی چیز "وحدت مقصد" کا وجود ہے۔ یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے ارد گرد قوم کے تمام افراد کے اعمال چکر کھاتے ہیں حکمراں اپنی حکومت کے تخت پر، واعظ اپنے منبر پر، سپاہی اپنے میدان میں، اہل پیشہ اپنے بازار میں، عالم اپنی درسگاہ میں، صنّاع اپنی کارگاہ میں، اخبار نویس اپنے دفتر میں یہاں تک کہ اس کے مجرم اور ڈاکو بھی اپنی کمین گاہ میں، اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ اسی ایک مقصد کے لئے جیتے ہیں اور مرتے ہیں۔

تعلیم کا پہلا مقصد
مقصد زندگی کی تبلیغ

تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ قوم کے افراد میں اس کے واحد مقصد کی تبلیغ اور تکمیل کا فرض انجام دے، قوم کے ہر فرد میں بچپن سے اس مقصد کی صحت کا یقین اور اس کی رفعت اور بلندی کی تقدیس اور اس کے حصول اور بقا کی خاطر ہر آزمائش اور امتحان میں پڑنے کی غیر متزلزل جرأت پیدا کرے۔

ہم کو پہلے سوچنا چاہئے کہ اول مسلمانوں کے سامنے اور خصوصًا ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہے بھی؟ اگر ہے تو ہندوستان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک کوئی درس گاہ اپنے سامنے وہ نصب العین رکھتی ہے؟

ہمارا پچھلا نظام تعلیم کتنا ہی برا ہی لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے سامنے ایک مقصد تھا، اور وہ مذہب کی خدمت اور اس کے زیر سایہ علوم و فنون کی تحصیل تھا۔ اس مقصد کا اثر یہ تھا کہ تعلیم ہمارے نظام زندگی میں ایک دنیوی نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ تھا یہاں تک کہ کتابیں اور کتابوں کے اوراق بھی ہمارے نزدیک مقدس اور ادب و احترام کے قابل تھے ہمارے اندر مذہب کی شیفتگی اور عقیدت تھی اور اس کی خدمت کے لئے ہر علم و فن کو سیکھتے تھے اور پڑھتے تھے۔ ہم نے فلسفہ یونان سے اور ریاضیات ہندوستان سے سیکھا اور اسی طرح دوسرے عقلی علوم بھی دوسری غیر مسلم قوموں سے لئے، مگر غور سے دیکھئے کہ ہمارے اسلاف نے ان میں پوری اصلاح و ترمیم کر کے ان کو اپنے نصاب درس میں اس طرح رکھا کہ وہ آج تمامتر اسلامی علوم معلوم ہوتے ہیں۔ ارسطو اور افلاطون کا فلسفہ جو کہتے ہیں دہریت سکھاتا ہے جب وہ ہماری مشرقی درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے تو پہلے اعوذ باللہ اور پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر شروع کیا جاتا ہے، خدا کا نام آتا ہے تو نیچر اور فطرت کے بے حس اور بے جذباتی ناموں سے اس کی تعبیر نہیں ہوتی بلکہ واجب تعالیٰ، باری تعالیٰ اور مبدء فیاض کے فلسفیانہ لیکن باادب ناموں سے اس کی تعبیر کیجاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فلسفہ پڑھنے کے باوجود مشرقی درسگاہوں کے طلبہ میں بے دینی یا مذہبی بے حسی پیدا

نہیں ہوئی۔

جب ہمارا فلسفی مصنف اپنے فلسفے کا آغاز کرے گا تو قرآن پاک اس آیت کی تعلیم کو اپنی غرض بتائے گا کہ ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا (جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی نیکی دی گئی) جب ہیئت و فلکیات کا درس دے گا تو تمہید میں یتفکرون فی خلق السموات والارض اور ربنا ما خلقت ھذا باطلا اور لتعلموا عدد السنین والحساب اور فلکیات کی دوسری مناسب آیتوں کو پہلے پیش کرے گا۔ جغرافیے کی کتاب لکھے گا تو کہے گا کہ یہ سیروا فی الارض کی تفسیر ہے۔ علم طب پڑھائے گا تو شفاء للناس اور العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان کو دیباچے میں ذکر کرے گا۔ فلکیات کی ایک کتاب کا مصنف امام غزالیؒ کے اس فقرے کو طغرائے فخر بنا کر آگے بڑھتا ہے ومن لم یعرف الھیئۃ والتشریح فھو عنین فی معرفۃ اللہ تعالیٰ (اور جس نے ہیئت اور علم تشریح کو نہیں جانا تو وہ خدا کی معرفت میں نامراد ہے) غرض جس علم و فن کو بھی ہماری کتابی تعلیم ہمارے سامنے رکھتی تھی اس کو اپنے مقصد میں رنگ کر پیش کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر عقلی علم و فن اور ہر دنیاوی صنعت و ہنر بھی سرتاپا دین اور یکسر مذہب کے پیکر میں جلوہ گر ہوتا تھا۔ ہمارے اساتذہ آج کل کے علمی دوکاندار اور دنیاوی پیشہ ور کی حیثیت نہیں بلکہ وارثِ پیغمبر، نائب رسول اور روحانی باپ کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے ہر شاگرد اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ استاد کے رنگ میں رنگ کر ظاہر ہو اور استاد بھی آج کل کی طرح اپنے کام کو داد و ستد کا معاملہ اور ایک سے لینے اور دوسرے ہاتھ سے دینے کی بنیوٹی

اور مزدوری کا پیشہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک مقدس کام اور دینی فریضہ۔ اس لئے اس راہ میں ان سے وہ وہ ایثار اور قربانی کے مظاہر و مناظر پیش ہوتے تھے جن کو آج کل لوگ مشکل سے باور کر سکتے ہیں۔

آج کل کی تعلیمی تاریخ میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں کہ چند روپیوں کی خاطر استاد اس کالج سے اُس کالج اور اس یونیورسٹی سے اُس یونیورسٹی میں دوڑے پھرتے ہیں اور صرف بڑی تنخواہ کو اپنی عزت کا ذریعہ جانتے ہیں اور ہمہ وقت پانچ پانچ دس دس روپئے کے اضافوں کی خاطر زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں۔

لیکن ہماری پچھلی تعلیمی تاریخ میں یہ واقعے بداخلاقی اور دون ہمتی کی مثال سمجھے جاتے تھے، اول تو تعلیم پر اجرت اور معاوضہ لینے ہی کو وہ تقویٰ اور دیانت کے خلاف سمجھتے تھے اور پھر لیتے بھی تھے تو وجہ کفاف سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ وہ بڑے بڑے علما جن کے ناموں کی عزت ہمارے دلوں میں ہے انھوں نے دس دس اور پندرہ پندرہ روپیوں پر اپنی زندگی بسر کر دی ہے اور لطف یہ کہ وہ اپنے اس ایثار کو ایثار کہہ کر لوگوں پر اپنے احسان کا بار بھی نہیں رکھتے تھے۔

تعلیم کے لئے وطن سے باہر نکلنا اور خصوصاً بیرونی ملکوں میں جانا آج ہمارے لئے تعجب انگیز سمجھا جاتا ہے، لیکن ایک وہ زمانہ بھی گذر چکا ہے جب ہماری نگاہوں کے سامنے زندگی کا مقصد اور حیات کا نصب العین تھا تو علم کی طلب میں نہ تو خشکی کی مسافت اور نہ تری کی ہولناکی ہماری ہمتوں کو پست اور ہمارے ارادوں کو کمزور کرتی تھی۔ محدثین

نے ایک ایک حدیث کی خاطر مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک کی سرزمین کو چھان ڈالا تھا۔ بخارا کا یتیم محمد بن اسمٰعیل بخاری اپنی بیوہ ماں کے زیر سایہ ترکستان سے عرب جاتا ہے اور وہ ایسی ہیں عراق، ایران اور خراسان کے ایک ایک مشہور شیخ کی درس گاہ کو چھان ڈالتا ہے۔ مصر کے طالب العلم خراسان آتے ہیں، خراسان کے مصر جاتے ہیں، اسپین اور سسلی سے چل کر عراق و مصر و شام و عرب آتے ہیں اور مصر و شام سے اسپین جاتے ہیں۔ بیت المقدس کے ایک عالم طاہر المتوفی ۵۰۷ھ نے علم کی طلب میں بغداد، مکہ، مدینہ، تنیس، دمشق، حلب، جزیرہ، اصفہان، نیشاپور، ہرات، جرجان، آمد، استرآباد، بوشنج، بصرہ، دینور، رَی، سرخس، شیراز، قزوین، کوفہ، موصل، مرو، نہاوند، ہمدان، واسط، اسدآباد، اسفرائین، آمل، اہواز، بسطام، خسرو یاد وغیرہ شہروں کی خاک چھانی۔ جغرافیے میں دیکھئے کہ یہ شہر افغانستان کے شہر ہرات سے لے کر ترکستان، خراسان، ایران، عراق اور شام تک پھیلے ہوئے ہیں۔

محمد بن مفرج اموی اندلسی کی راہ طلب میں یورپ، افریقہ اور ایشیا تین براعظموں کے شہر داخل ہیں، اسپین کا شہر قرطبہ، افریقہ کا شہر مصر اور ایشیا کے شہر دمشق، صنعاء اور زبید (یمن)، ان کے تعلیمی مقامات ہیں۔ ولید اندلسی پیدا تو یورپ کے شہر سرقسطہ (سراگوزہ) میں ہوئے لیکن اندلس سے لے کر خراسان تک کوچہ گردی کی۔ ابو محمد عبداللہ بن عیسیٰ بن ابی حبیب اندلسی علم اور وزارت کے خانوادے سے تھے۔ وہ اسپین سے فارغ ہو کر اسکندریہ اور مصر آئے، پھر مکہ گئے، پھر عراق میں داخل ہوئے اور بغداد

میں مقیم رہے، پھر خراسان کی راہ لی اور نیشاپور اور بلخ میں قیام کیا، پیدا اسپین کی خاک میں ہوئے اور ۵۴۰ھ میں افغانستان کے شہر ہرات میں پیوندِ زمین ہوئے۔ حسین بن احمد پیدا قرطبہ میں ہوئے اور ۴۵۶ھ میں یمن کی سرزمین میں دفن ہوئے۔

تاج الدین سرخسی ۵۴۳ھ میں پیدا خراسان کے شہر سرخس میں ہوئے۔ نشو و نما شام میں ہوئی اور وفات ۵۹۴ھ میں اندلس میں پائی۔ نحو کے مشہور امام ابو علی قالی پیدا عراق کے شہر دیار بکر میں ہوئے، پھر تعلیم و تعلم کی خاطر ملکوں کی سیر کرتے بغداد اور موصل سے چل کر اسپین میں جا کر دم لیا اور ۳۵۶ھ میں قرطبہ میں وفات پائی۔ ابن المقری اصفہان کے محدث تھے جنھوں نے اصفہان، بغداد، موصل، حران، عسقلان، کوفہ، تستر، مکہ، بیت المقدس، دمشق، صیدا، بیروت، عکہ، رملہ، واسط، عسکر مکرم، حمص، رقہ اور مصر تک چار مرتبہ آمد و رفت کی۔ کہتے ہیں کہ ابن فضالہ کی ایک تصنیف کے نسخے کی خاطر ستر مرحلے سفر کے طے کئے اور اس کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی نان جو کے سامنے ایک روٹی کے معاوضے میں اس کو پیش کیا جاتا تو وہ اس کو قبول نہ کرتا۔

حماسہ کے مشہور شارح تبریزی کا یہ واقعہ سننے کے قابل ہے کہ وہ پیٹھ پر کتابوں کا پشتارہ باندھے جب پیادہ اپنے وطن سے ابو العلا معری کی خدمت میں شام پہنچے ہیں تو پسینے سے کتابوں کی یہ حالت تھی کہ ان کا ایک ایک ورق دوسرے سے چپک گیا تھا۔

آج یورپ کی مشہور یونیورسٹیوں میں دنیا کے گوشے گوشے کے طالب علموں کو

دیکھ کر ہم دنگ رہ جاتے ہیں لیکن اگر پچھلے عہد کی دکھانے والی دوربینیں ہوتیں تو آپ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، دمشق، صنعار، قاہرہ، بغداد، بخارا، ہرات اور نیشاپور میں ان سے بھی زیادہ حیرت انگیز منظر دیکھ سکتے۔

میں اس عہد کی صرف دو درسگاہوں کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ایک کوفہ میں حضرت امام ابوحنیفہ کی درسگاہ اور دوسری مدینہ منورہ میں امام مالک کی۔ ابوحنیفہ کے حلقۂ تعلیم میں مکہ، مدینہ منورہ، دمشق، بصرہ، واسط، موصل، جزیرہ، رقہ نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان استرآباد، ہمدان، نہاوند، ری، قومس، دامغان، ترمذ، ہرات، نہستار، خوارزم، سیستان مدائن، مصیصہ اور حمص کے طلبہ شریک تھے۔ ذرا نقشے میں ان شہروں کے بُعدِ مسافت پر نظر ڈال لیجئے۔

امام مالک کی درسگاہ مدینہ منورہ میں ہے۔ حالت یہ ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے سے موجیں اٹھتی ہیں اور یثرب کی پہاڑیوں سے آکر ٹکراتی ہیں، عرب کے شہروں میں مکہ معظمہ، صنعا، عدن، طائف، یمامہ، ہجر، حضرموت، زبید، فدک، شام کے شہروں میں سے ایلہ، دمشق، عسقلان، خلاط، مصیصہ، بیروت، حمص، طرسوس، رملہ، نصیبین حلب، بیت المقدس، رون، صور اور انطاکیہ، اور عراق کے شہروں میں سے بغداد بصرہ، کوفہ، حران، موصل، جزیرہ، واسط، انبار، رقہ، رہا، اور ممالک عجم میں سے جرجان، کرمان، ہمدان، رے، طالقان، نیشاپور، طبرستان، طوس، مدائن، قزوین

قومستان، چغان، آمد، کردستان، دینور، سیستان، ہرات، بخارا، سمرقند، خوارزم (خیوا) مرو، سرخس، ترمذ، بلخ، نسا، مشرق ہو چکا، اب مغرب کی طرف چلئے۔ مصر کے شہروں میں قاہرہ، اسکندریہ، فیوم، اسفان، تینس، اور شمالی افریقہ اور اسپین کے شہروں سے افریقیہ، تونس، قیروان، برقہ، طرابلس، مراکش، طلیطلہ، بطنہ، باجہ، قرطبہ، سرقسطہ اور اٹلی کی سسلی اور ایشیائے کوچک کے سمرنا ازمیر سے طالب العلم آ اور جا رہے تھے۔

ان واقعات کو سنتے وقت یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس وقت دنیا میں نہ آج کی طرح ریلیں تھیں جنھوں نے ایک شہر کو دوسرے شہر سے ملا دیا ہے اور نہ ہوائی جہازات تھے جنھوں نے ایک ملک کو دوسرے ملک سے جوڑ دیا ہے اور برسوں کے سفر کو ہفتوں میں اور مہینوں کے راستوں کو دنوں میں اور دنوں کی مسافت کو گھنٹوں میں طے کرتے ہیں اور وہاں نہ ڈاک اور تار کے یہ انتظامات تھے جو گھر بار اور اہل وطن کی خبریں دمبدم پہنچاتے رہتے ہیں اور نہ یہ ہوٹل اور مسافر خانے تھے جو مسافروں کو گھروں سے زیادہ آرام پہنچاتے اور نہ کوک کمپنی کا وجود تھا جو رتی سے پہاڑ تک کا انتظام آپ کے لئے شہر شہر کرتی پھرتی ہے۔

لیکن ایک لمحہ ٹھیرئیے۔ یہ گذشتہ عہد کی داستان کہن استخواں فروشی کے لئے آپ کو نہیں سنائی گئی ہے بلکہ اس سوال کے جواب کے لئے کہ وہ کونسا جذبہ تھا جو طالب علموں کو اس زمانے میں اس طرح کوچہ بہ کوچہ، شہر بہ شہر اور ملک بہ ملک

لئے پھرتا تھا کہ نہ ان کو پہاڑ روکتے تھے، نہ جنگل ڈرلتے تھے، نہ دریا عائق ہوتے تھے پھر وہ کیا جوش و خروش تھا جو ان کو اس راہِ طلب میں اس طرح بے چین اور مضطرب رکھتا تھا۔

ہیچ گہ ذوق طلب از جستجو بازم نداشت　　دانہ می چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

عزیزو! وہ صرف ان کا وہ مقصد زندگی اور نصب العین تھا جس کو "دین کا ولولہ" اور "مذہب کا جوش" کہتے ہیں۔ یہ ان کی زندگی کی روح تھی اور ان کی حیات کا مقصد۔ ان کے قبضے میں یہی کا وہ خزانہ تھا جس سے ان کی تعلیم، تمدن، تجارت، صنعت، سلطنت، حکومت، فتوحات، غرض ایک بامراد قوم کے وہ تمام کارخانے جو زندگی کے مختلف شعبوں سے عبارت ہیں چل رہے ہیں۔

اس سے دوسرے درجے پر جو جذبہ ہے وہ سیاست ہے۔ اگر اسلام میں دین خود سیاست ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سیاست کا جذبہ کار اس میں دین کے تحت ہے۔ ایک اللہ کے ماننے والے خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، ایشیائی ہوں یا اروپی سب کے سب سلطنت میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ اسلام میں صلح و جنگ اور فتوحات کی ترقی، تجارت، ملک گیری اور قوموں کو غلام بنانے کی نیت سے نہیں بلکہ اگر ہے تو صرف اس لئے ہے کہ انسانوں میں قومیت، وطنیت اور رنگ و روپ کی مختلف برادریوں کی جگہ ہم خیالی کی ایک برادری قائم ہو جائے، انسانوں کے درمیان طبعی اور فطری تفرقوں کو "ملیت" کی بنیاد نہ قرار دیا جائے جو کبھی ٹوٹ اور مٹ نہیں سکتے بلکہ ان خیالات و ذہنیات کو قرار دیا جائے جن کو سوچنے اور سمجھنے کے بعد ہر انسان

بدل سکتا ہے۔

توحید اسلام کی وہ رنج ہے جس نے دین کے علاوہ سیاست کا کام بھی انجام دیا اور کم از کم بارہ سو برس تک اس نے ہر میدان میں اسلام کے علم کو بلند رکھا ہے، اسلام کا ہر سپاہی تن تنہا تلوار ہاتھ میں لے کر نکلتا تھا اور چند روز میں نومسلموں کی ایک جماعت اپنے ساتھ لے کر دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں اپنی سلطنت کھڑی کر لیتا تھا، افریقہ میں بحری جزیروں میں اور مختلف ملکوں کے دور دراز گوشوں میں اس طرز سیاست نے بڑی بڑی ریاستیں اور حکومتیں کھڑی کر دیں۔ اسی طرح غلاموں کو اسلام کی آزادی سے مالا مال کر کے ان کو شمشیر زنی، کشور کشائی اور تخت نشینی کا اہل بنا دیا۔ مصر میں غلاموں کی سلطنت صدیوں تک اسی طرح چلتی رہی ہے۔ اسپین اور مراکش کے فاتح یہی بربری نومسلم ہیں جنھوں نے بارہا شمالی افریقہ میں حکومتیں کیں۔

وہ کون سا جذبہ تھا جو نومسلم ترکوں، تاتاریوں اور مغلوں کو ایک علم کے زیر سایہ منظم کر کے چین کی دیواروں سے لے کر قسطنطنیہ کے سواحل تک کے ملکوں پر ان کو بارہا حکمراں بناتا رہا۔ سبکتگین ایک معمولی ترک غلام سپہ سالاری تک پہنچا اور پھر غزنی میں بیٹھ کر وہ خاندان پیدا کرتا ہے جو ہندوستان پر سو سال تک چھایا رہتا ہے۔ غور کے نومسلم جو محمود ہی کے مسلمان بنائے ہوئے ہیں، وہ اٹھتے ہیں اور آندھی کی طرح غزنی سے لے کر بحر ہند تک پر قابض ہو جاتے ہیں۔

ان مثالوں سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں یہ دکھاؤں کہ اسلام نے کیوں کر

دین ہونے کے ساتھ سیاست کا فرض انجام دیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اسلام کا جذبۂ دین بجائے خود اس قدر پُرزور اور قوی ہے کہ اس کو اپنی زندگی کے لئے کسی الگ سیاسی قوت کا سہارا ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے ؎

عشق خود راہ است و ہم خود منزل است

بایں ہمہ اس حقیقت سے تغافل نہیں برتا جا سکتا کہ یورپ نے دو سو برس سے مشرقی قوموں اور اسلامی ملکوں میں جو فساد برپا کر رکھا ہے اس کے لئے یہ لازمی ہو گیا ہے کہ ایک ملک کی بسنے والی تمام قومیں اور جماعتیں باہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اس طرح دوش بدوش کھڑی ہوں کہ حریف ہماری صفوں کو چیر کر درہم برہم نہ کر سکے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اسلامیت اور وطنیت کو ٹکرانے کے بجائے اسی طرح ان میں تطبیق دی جائے جس طرح ہم عقل و نقل اور معقول و منقول کو تطبیق دیتے ہیں۔ غلط فہمی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلامیت اور وطنیت باہم ایسے حریف ہیں جن میں کبھی صلح نہیں ہو سکتی۔ اسلامیت کے حامی ہر چیز میں مسلمانوں کی علیحدگی کے خواہاں ہیں اور وطن کی دوسری قوموں سے مل کر متحدہ محاذ کے بجائے محاذ کو تقسیم کر کے اس کی حفاظت اور مدافعت کے فرائض کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف وطنیت کے طرفدار اس تفریق و امتیاز کے لئے مذہب کو ذمہ دار سمجھ کر اسلامیت کے جذبات سے تبرّی کرنے پر آمادہ ہو رہے ہیں۔ پہلے کا نتیجہ اگر وطن کی خدمت سے قصور ہے تو دوسرے کا نتیجہ مذہب سے بیزاری ہے اور

یہ دونوں نتیجے ہم کو ہلاکت اور بربادی کی طرف لے جا رہے ہیں، حالانکہ جس طرح عقل و نقل کی تطبیق ممکن ہے، ایسے ہی دین اور وطن کی تطبیق بھی ممکن ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت اور جمعیۃ علما کے نظریۂ سیاست نے امکان کو واقعے کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ کیا سنہ ۱۹۲۰ء کا خلافتی اس عہد کے کانگریسی سے کسی حیثیت میں پست تھا اور موجودہ عہد تحریک میں جمعیتی خادمان وطن کانگریسی خدمت گذاروں سے کسی بات میں کم ہیں؟ حالانکہ سب کو علم ہے جمعیۃ العلما سرتاپا مذہبی جماعت ہے اور باینہمہ وطنی خدمات میں خالص وطن پرستوں سے کسی درجے کم رتبہ نہیں۔ میرے نزدیک جس طرح ندوۃ العلما کی درسگاہ عقل و نقل کی تطبیق ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیت اور وطنیت کی تطبیق ہے اور اسی لئے یہ دونوں درسگاہیں مسلمانوں کی آئندہ تعلیم میں بہت بڑا اثر رکھیں گی۔

میرے نزدیک جب تک ہندوستان کے مسلمان اسلامیت اور وطنیت کی کشمکش کا بہترین فیصلہ نہ کریں گے اس ملک میں ان کا مستقبل حد درجہ خطرناک رہے گا۔

ہندوستان میں اسلامیت اور وطنیت کی مصالحت اور تطبیق

ان تمام ملکوں میں جہاں مسلمانوں کو تعدادی اکثریت حاصل نہیں ہے، ان کے دینی اور وطنی فرائض میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ خالص مذہبی اور قومی امور و مسائل میں اپنی حکومت کے زیر سایہ نیم خود مختاری حاصل کر کے ملک کے عام سیاسی و انتظامی امور و مسائل میں اپنے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ اشتراک عمل کریں۔ صاف لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اپنے مذہبی و تمدنی مسائل میں جن سے قومیت عبارت

ہے ان کی وطنی حکومت ان کو اپنے زیر سایہ خود مختاری عطا کرے اور دیگر عام ملکی سیاسی انتظام و مسائل میں وہ دیگر فرزندان وطن کے دوش بدوش ایک متحدہ نظام کا جزو ہو کر اپنی تعدادی حیثیت کے مطابق اشتراک عمل کریں۔ موجودہ سیاسی اصطلاح میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرف مسلمان اپنے لئے بلا شرکت غیرے "کلچرل آٹانومی" ٨ حاصل کریں اور دوسری طرف عام ملکی سیاسیات میں وہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ شریک رہ کر اپنی آبادی کے مطابق حقوق اور نمائندگی پر قناعت کریں۔ اس طرح مسلمانوں کی ایک امتیازی قومی حیثیت بھی قائم ہوجاتی ہے اور دوسری طرف ان پر وطنی اتحاد کے توڑنے کا الزام بھی قائم نہیں ہوتا۔ جن مذہبی و قومی اغراض و مصالح کی حفاظت کی خاطر وہ نمائندگی اور انتخاب نمائندگی کی علحدگی کا مطالبہ کرتے ہیں وہ بجائے خود علحدہ نمائندگی سے طے ہوں گے اور پھر دوسری طرف عام سیاسیات میں ان کو دوسروں سے نہ کوئی رعایت چاہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ استحقاق سے زیادہ مطالبے کی بھیک مانگنے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے اور نہ لوگوں کو عام ملکی معاملات و سیاسیات میں ان کی مخصوص قومی معاملات میں علحدگی کی بنا پر ملکی تفرقے کا خیال پیدا ہوسکتا ہے۔

اس طرح مسلمانوں کی دو مجلسیں ہوں گی، ایک خالص اسلامی جو ان کے خالص اسلامی امور و معاملات کا فیصلہ کرے گی اور دوسری مخلوط مجلس خواہ وہ مخلوط ہی انتخاب سے ہو جو عام ملکی مسائل کا تصفیہ کرے گی۔

ہم نے جہاں تک ان مسائل پر غور کیا ہے ہم کو اس سے زیادہ بہتر حل اس

شکل مسئلے کا نظر نہیں آتا۔ یقیناً کسی ایسے نظام کے جزئیات کو طے کرنے اور اس کو بنا کر کھڑا کرنے میں جو پہلے سے ملک میں رائج نہ ہو ایک اجنبیت محسوس ہوتی ہے مگر جس طرح ہر نئی اصلاحات کے ہر تطاعم کو بالآخر ہم طے کر کے عمل میں لاتے ہیں اسی طرح اس پر بھی ہم عمل کر سکتے ہیں۔

اس مختصر تشریح سے یہ ظاہر ہو گا کہ ہندوستان میں ہماری قومی زندگی کے حسب ذیل مقاصد ہیں:-

۱- پیغام اسلام کی تعمیل حفاظت اور بقا۔

۲- اس ملک کے لئے ایک عام جمہوری نظام حکومت کا قیام۔

۳- اس عام ملکی جمہوریہ کے ماتحت خالص "اسلامی کلچرل اٹانومی" کا قیام۔

یہ وہ مقاصد ثلاثہ ہیں جن کو ہم اپنی قومی زندگی کی روحِ عمل قرار دے سکتے ہیں۔ ان کے لئے جد و جہد، اشاعت و تبلیغ اور بالآخر کامیابی اور کامیابی کے بعد ان کی حفاظت اور بقا ہماری قومی زندگی کا مستقل پروگرام ہو سکتا ہے۔

شاید اس موقع پر مجھ سے اپنے موضوع سے ہٹنے کی باز پرس کی جائے لیکن اگر میری تقریر کا پچھلا حصہ حاضرین کے ذہن نشین ہے تو یقیناً وہ میری طرف سے اس باز پرس کا جواب دے سکتے ہیں۔ میرے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کے بچوں کو ان کی زندگی کے قومی مقاصد کی تلقین اور تفہیم کرے اور ان کے اندر ان مقاصد کی یقینیت کی روح پیدا کر کے ان کو سرتاپا عمل بنائے۔ دنیا میں آج جہاں کہیں کوئی

قومی حکومت ہو اسی اساس تعلیم پر ان کی قومی عمارت کی بنیاد قائم ہے۔ انگلستان میں جس طرح آکسفورڈ اور کیمبرج انگریزوں کے تعلیمی مرکز ہیں اسی طرح ان کے نظری سیاسیات کے مرکز بھی ہیں۔ وزیر اعظم سے ے کر معمولی رکن پارلیمنٹ تک ان درسگاہوں کے احاطوں میں آکر اپنی سیاسیات کے نظریوں کو بیان کرتا اور وہاں کے طالب علموں کو آئندہ کی سیاسی ذمہ داری کے لئے تیار کرتا رہتا ہے۔

اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ موجودہ نظام حکومت نے ہندوستان پر سب سے بڑا ظلم کیا کیا ہے تو میں کہوں گا کہ اس کا سب سے بڑا ظلم اس ملک کے بچوں کی بے مقصد تعلیم ہے جس نے پوری قوم کی زندگی کو بے مقصد بنا دیا ہو اور دنیا میں ایک ایسی قوم کی تخلیق کی ہو جس کی زندگی کی کوئی غایت نہیں ہو۔

سبب کھلا ہوا ہے۔ انگریزی حکومت نے اس ملک کی تعلیم کو قومی تعلیم و تربیت کی نظر سے نہیں بلکہ سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا۔ اس کو ضرورت ہوئی کہ مسلمانوں کی اور دوسری قوموں کی اس روحانی زندگی پر موت طاری کر دی جائے جس سے قومی و مذہبی عصبیت پیدا ہوتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہوا کہ اس تعلیم کو ہر قسم کی مذہبی اور قومی تعلیم کی اسپرٹ سے خالی کر دیا جائے۔

دوسری طرف اس کو اپنی سلطنت کے چلانے کے لئے ایسے کم قیمت دیسیوں کی ضرورت تھی جو اس کے محکموں کے دفتری کاروبار کو سنبھال سکیں۔ اس لئے ایک ایسا نظام تعلیم جاری کیا جس میں کوئی زندگی نہ تھی اور علوم میں سے بھی صرف

وہ چیزیں سکھائی جائیں جن کی ضرورت آئندہ بننے والے کلرک (بابوؤں) کو پیش آسکتی ہو۔ اسکول تک ہم کو کیا سکھایا جاتا ہے؟ ایک ایسی بدیسی زبان جس کے ذریعے سے ہم اپنے افسروں سے گفتگو کر سکیں اور ان کے لئے ان کی زبان میں ان کے لئے مواد مہیا کر کے رکھ سکیں، اور جغرافیہ جس میں زیادہ تر ہم یہ جانیں کہ وہ دنیا کے کون کون سے براعظم جزیرے اور ٹاپو ہیں جہاں وہ علم لہراتا ہے جس کا آفتاب دنیا سے کبھی نہیں ڈوبتا اور تاریخ جس میں ہم کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ قوموں نے کیوں کر ایک دوسرے پر ظلم کیا ہے تاکہ اس ملک کی قومی تفرق کا ناسور کبھی بھرنے نہ پائے۔

ہندوستان کی تاریخ کا وہ حصہ جس میں ہندوستان کی انگریزی شہنشاہی کے بنانے والے لارڈوں کا ذکر ہوتا ہے پڑھ کر بے انتہا ہنسی آتی ہے۔ ہر لارڈ نے اس ملک کی اصلاح کی خاطر جو تکلیفیں اٹھائی ہیں اور جو انتظامات کئے ہیں ان کا ذکر ہوتا ہے پھر وہ رخصت ہو کر جب جاتا ہے اور دوسرا آتا ہے تو پھر انہیں مناقب کی تکرار ہوتی ہے۔ اس لغو طریقہ نصاب کا جس قدر جلد ہندوستان سے خاتمہ کیا جا سکے اسی قدر بہتر ہے اور اس کے بجائے ہم کو وہ انصاب اختیار کرنا چاہئے جن سے ہمارے قومی مقاصد کے جذبات کی پرورش اور تکمیل ہو اور قوم کو زندہ قوم، سرگرم عمل قوم اور بامقصد قوم بنائے۔

ہم نے ہزاروں اور لاکھوں کے صرف سے ملک میں جا بجا اسلامی اسکول اسلامی کالج بلکہ اسلامی یونیورسٹی قائم کی ہے لیکن اس سوال کا کوئی جواب ہے؟

قومی نقطۂ نظر سے اس قسم کے اسلامی اسکول، اسلامی کالج اور اسلامی یونیورسٹی کس قدر مفید ثابت ہوئے ہیں اور بے مقصد تعلیم کے سوا ان سے کیا فائدہ پہنچا ہے بجز اس کے کہ ان کے قیام سے چند مسلمان ماسٹروں اور پروفیسروں کی پرورش ہوتی ہے اور کچھ مسلمان طالب علموں کو کلاس میں جگہیں مل جاتی ہیں۔ مگر ان کو اس نظر سے اگر دیکھا جائے کہ یہ قوم کے ذاتی سرمائے سے سرکاری نظام تعلیم کی اشاعت کا فرض انجام دیتا ہے تو یہ بالکل لاحاصل معلوم ہوتے ہیں کہ قومی سرمایہ سے جو اسکول اور کالج قائم ہوتے ہیں وہ قومی نتائج کے لحاظ سے سرکاری مدارس سے کس حال میں بہتر ہیں؟ اسی لئے میرے نزدیک سرکاری نظام تعلیم کی مجبورانہ پیروی کی حالت میں بہتر یہ ہے کہ ہم اس سرمایہ کو طلبہ کے وظائف دینے اور شہروں میں صرف اسلامی دارالاقامے قائم کرنے میں صرف کریں کہ ان اسلامی اسکولوں اور کالجوں سے جو فائدہ پہنچنا ممکن ہے وہ درسگاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ دارالاقامے کی حیثیت سے ہے۔

بہرحال یہ ایک جملۂ معترضہ ہے کہنا یہ ہے کہ بے مقصد تعلیم سے قومی ترقی اور ملت کی زندگی کی توقع رکھنا پنجاہ سالہ تجربے کو جھٹلانا ہے اور اس تعلیم نے صرف نوشت و خواند کے ہنر کی تعمیم و اشاعت کے لحاظ سے خواہ کسی قدر فائدہ پہنچایا ہو مگر قوم کی زندگی اور ملت کی سربلندی میں اس سے فائدے کے بجائے روز افزوں نقصان پہنچ رہا ہے۔ مذہبی مقصد زندگی سے تغافل کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حرف لایعنی جن کا زبان پر لانا بھی پہلے مشکل تھا اب وہ برملا ادا کئے جا رہے ہیں اور قومی تخیل سے بے پروائی کا نتیجہ

یہ ہے کہ قومیت کا شیرازہ بکھر رہا ہے اور خیالات و اعتقادات کی وحدت کی گرفت جس سے وحدتِ قومیت عبارت ہے ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے اور ایک ایسی قوم پیدا ہو رہی ہے جو ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے حکمراں قوم کے لفافہ کی صرف نقل ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے لئے سنہ ۱۹۱۰ء میں جس وقت ملک میں جوش و خروش برپا تھا۔ مولانا شبلی مرحوم نے لاہور کے وفد میں اپنی وہ فارسی نظم پڑھی تھی جس کا ایک مصرع یہ ہے۔

کہ ایں سررشتۂ تعلیم ما در دست ما باشد

لسان العصر اکبرؔ مرحوم نے فوراً اس پر برجستہ جوابی نظم کہی تھی جس کے ایک مصرعے کے آخری الفاظ یہ تھے "مگر در دست شما باشد" لوگوں نے شاید اس کو صرف شاعرانہ سوال و جواب پر محمول کیا ہو مگر بیس برس کے بعد معلوم ہو گیا کہ لسان العصر نے جو شبہ ظاہر کیا تھا وہ شبہ نہیں حقیقت تھا۔ اس طول بحث اور درازنفسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اب یہ حقیقت واقعہ بن کر سامنے آ جانا چاہئے کہ ان کو پہلے اپنا قومی نقطۂ نظر اور ملی زندگی کا مقصد معین کرنا چاہئے اور اس پر اپنی تعلیمی عمارت کی بنیاد قائم کرنی چاہئے اور آئندہ ہماری درسگاہیں صرف نوشت و خواند کا حرفہ اور پیشہ سکھانے کے لئے نہ ہوں بلکہ زندہ قوم کے افراد کی تخلیق اور آفرینش کے لئے ہوں۔

اسی لئے مسلمانوں کی آئندہ تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ ایسی درسگاہیں بکثرت قائم

کی جائیں جو بامقصد ہوں اور ان کا سر رشتہ واقعی مسلمانوں کے حقیقی ہاتھوں میں ہو۔ مسلمانوں نے اس ملک پر ایک ہزار برس تک حکومت کی مگر انھوں نے ہندوستان پر یہ ظلم کبھی نہیں کیا کہ یہاں کے کروڑوں دماغوں کی تربیت اپنے سیاسی ہاتھوں میں لے کر ان کو مذہبی و قومی جذبات سے یکسر خالی کر دیں، اب ضرورت ہی کہ مسلمان اس نظام تعلیم سے علانیہ بغاوت کریں اور ایسی درسگاہوں کی بنیاد قائم کریں جو ان کو ان کی زندگی کا مقصد بتائیں اور ان پر ان کی حیات ملی کے اسرار کھولیں۔

ایک زمانہ تھا کہ جب سرکاری نوکری ہی مسلمانوں کی زندگی کا تنہا مقصد تھی۔ اس وقت ملک کی عربی درسگاہوں پر یہ پھبتی کہی جاتی تھی کہ یہ اپاہجوں کے پیدا کرنے کی کلیں ہیں۔ اس طعن کو قبول کر لینے کے بعد بھی ہم یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بظاہر خواہ کسی قدر پست و مبتذل حالت میں ہوں تاہم وہ بامقصد ہیں اور اپنے مقصد پر ان کو ناز ہے اور زمانے نے بتا دیا کہ زمانے کی بے التفاتیوں اور بے توجہیوں کے باوجود وہ زندگی رکھتی ہیں اور آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ آج کل کے ایک بڑے سرگرم کانگریسی نے مجھ سے یہ کھلا اعتراف کیا کہ موجودہ قومی مقاصد کے سمجھنے میں اور ان پر عمل کرنے میں آزاد عربی مدارس کے تعلیم یافتہ غلام انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ سے بڑھ کر ثابت ہوئے۔ اس کا سبب بالکل کھلا ہوا ہی کہ آزاد عربی مدارس کی تعلیم کا مقصد سرکاری نوکری اور سرکاری اعزاز کی تلاش نہیں جو ہمارے ہر قومی حوصلے کو پست کر دیتی ہی۔

مسلمانوں کی علیحدہ تعلیم اوپر کے معروضات اگر ذہن نشین ہوں تو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں عذر نہ ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی با مقصد تعلیم کے لئے یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ ان کی قومی درسگاہیں بالکل الگ ہوں جہاں ان کو خاص ان کے مذہبی و قومی مقاصد کی بنا پر تعلیم دی جائے، ہمارے بہت سے مسلمان دوستوں کی یہ خواہش ہے کہ سرکاری کونسلوں میں ان کی نشستیں معین ہوں اور ان نشستوں کا انتخاب مخلوط نہ ہو تاکہ مسلمانوں کی مستقل ہستی قائم رہے۔ میرا خیال ہے کہ سرکاری نشستوں میں عدم مخلوط انتخاب سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت مخلوط نہ ہو تاکہ ان کی علیحدہ قومی ہستی فنا نہ ہو جائے اور ان کے قومی مقصد کی مستقل زندگی برباد نہ ہو جائے۔

اسی اصول کی بنا پر مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت غور و فکر کے قابل ہے۔ مسلمان ملک کی دوسری قوموں کی طرح میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ٹیکس ادا کرتے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی تعلیم سے بہت کم فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اکثر میونسپل اور تحصیلی اسکول تقریباً ہندو اسکول ہیں۔ وہاں کی تعلیم کیا اپنی زبان کے لحاظ سے اور کیا اپنے جذبات کے لحاظ سے تمام تر ہندو ہے مذہبی تعلیم سے وہ یکسر خالی اور جذبات ملی سے یکسر عاری ہیں۔ ایسی حالت میں مسلمان طلبہ کا ان میں کم ہونا قدرتی بات ہے۔

یہ تو ان مدارس کا سلبی پہلو ہے، ایجابی پہلو یہ ہے کہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ

کے ابتدائی مکاتب دیہاتی اور شہری ہندو آبادی کی ابتدائی تعلیم کے تمامتر کفیل ہیں مگر مسلمان ان مدارس و مکاتب سے بجا طور پر احتراز کر کے نہ تو خود اپنی طرف سے اور نہ سرکار کی طرف سے ابتدائی مکاتب کا اتنا وسیع سلسلہ اپنے قبضے میں رکھتے ہیں ایسی حالت میں دوسری قوم کے مقابلے میں مسلمانوں کا ابتدائی تعلیم میں کم ہونا بالکل کھلی بات ہے۔ یو۔ پی میں سرکاری اسلامی مکاتب کی اسکیم بھی اسی لئے ناکام ہے کہ ان کے لئے بھی ان کے سررشتے کا خاص لازمی نصاب قبول کرنا ضروری ہے جو ہمارے اغراض کے مطابق نہیں۔

مکتبی تعلیم کا نظام پورا ملک ابتدائی اسلامی مکاتب کے متحدہ نظام کے سلسلے سے بالکل محروم ہے۔ جا بجا شخصی یا جماعت کے چندوں سے کہیں کہیں بعض مکتب ہیں جن میں سے ہر ایک انفرادی طریق تعلیم اور الگ نصاب پر جاری ہے اور جو ہر قسم کی ترقی کی اسکیم سے محروم ہے۔ پورے ملک میں چھوٹے بچوں کا ایک بھی معیاری مکتب نہیں جو چھوٹے بچوں کی مکتبی تعلیم و تربیت کا نمونہ پیش کرے۔ جامعہ ملیہ کے کارفرما دوستوں اور ندوۃ العلماء کے ارکان کے سامنے میں نے اس ضروری تجویز کو پیش کیا ہے مجھے خوشی ہے کہ جامعہ کے کارفرما ادھر توجہ کر رہے ہیں اور ان کے احاطے میں اس قسم کے معیاری مکتب کے بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ گورکھپور میں انجمن اجرائے مکاتب کے نام سے ایک مجلس نے چند سال سے کام شروع کیا ہے اور اس وقت تک چالیس مکتب ضلعے میں قائم کئے ہیں، اسی قسم کے اجرائے مکاتب کی ہر ضلعے میں ضرورت

ہے جن کے پیشِ نظر صرف ابتدائی مکتبی تعلیم ہو اور ہمارا حق پہنچتا ہے کہ ہم میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے اپنے ان مکتبی سلسلوں کے لئے مالی امداد کا جائز مطالبہ کریں۔ اور جب کبھی ہندوستان کے نظامِ حکومت کا آسمان و زمین بدلے ہم یہ مطالبہ کریں کہ مسلمانوں کی اس تعلیم کا پورا انتظام اس صیغے کے سپرد کر دیا جائے جس کا مطالبہ مسلمان اپنے مستقل قومی و مذہبی امور و معاملات کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔

میری اس گذارش سے اس نتیجے تک پہنچنا آسان ہے کہ قومی تحفظ کے لئے مسلمانوں کے غیر مخلوط انتخاب کے مطالبے سے بہت زیادہ ضروری غیر مخلوط تعلیم کا مطالبہ ہے خصوصاً جب وہ وقت آئے گا کہ ملک میں جبری تعلیم کا نفاذ ہو اُس وقت مسلمانوں کے لئے علیحدہ مستقل نظامِ تعلیم کی ضرورت آج سے زیادہ عیاں ہو جائے گی۔

ضرورت ہے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم پر پوری توجہ کیجائے اور اس کے لئے ٹرینڈ معلم تیار کئے جائیں اور بچوں کے نفسیات سے باخبر اہلِ قلم ان کی استعداد کے مطابق ایسا تدریجی نصاب بنائیں جو سادہ سے سادہ سہل سے سہل ہو۔ حمایت اسلام لاہور کا نصاب بہت کچھ مقبول ہے مگر افسوس ہے کہ اس میں الفاظ کے استعمال میں بے احتیاطی برتی گئی ہے مثلاً دینیات کی پہلی ہی کتاب میں محتاج، پیغمبر وغیرہ الفاظ جو پانچ پانچ حرفوں سے مرکب ہیں، استعمال کئے گئے ہیں کیا بچہ آسانی سے ان کا تلفظ کر سکتا ہے۔ نصاب کے الفاظ چھوٹے چھوٹے آسان اور سہل ہوں۔ ان کی کتاب اس احتیاط سے چھاپی جائے کہ ہر نقطہ اور شوشہ اس طرح اپنی جگہ پر لکھا ہو کہ بچے کو اشتباہ نہ ہو۔

ابتدائی تعلیم میں دو اور مشکلیں حل کرنی ہیں، قرآن پاک کے پڑھانے کے آسان طریقے کی تلاش تاکہ قرآن پاک جلد سے جلد ختم ہو سکے۔ لوگ قرآن پاک پڑھانے کے لئے پہلے قواعد بغدادی یا یسرنا القرآن وغیرہ پڑھاتے ہیں اور اسی سے تعلیم کا آغاز کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ طریقہ غلط ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ پہلے بچے کو اردو پڑھائی جائے اور جب اردو داں ہو جائے تو اردو عبارت عربی خط میں چند روز پڑھائی جائے اس کے بعد قرآن پاک شروع کرا دیا جائے۔ اس سے کم از کم ایک سال کا وقت بچ جاتا ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ بچوں کے لئے ایسے قرآن چھاپے جائیں جن میں خط کی بلکہ ہر حرف کی اور نقطے اور شوشے کی پوری احتیاط کتابت میں کیجائے تاکہ حروف اور نقطے بچوں کی نظروں میں مشتبہ نہ ہونے پائیں۔ اور ہر حرف کی صرف ایک ہی شکل پورے قرآن کی کتابت میں اختیار کی جائے تاکہ اختلاف صور بچوں کا ذہن اس حرف کے پہچاننے میں مشوش نہ کرے۔

پھر اس پر بھی غور کرنا ہے کہ ہندوستانی زبان کے مفرد اور مرکب حروف اور الفاظ کے پڑھنے کی آسان سے آسان صورت کیا ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ انجمن ترقی اردو کے سوا اور کسی نے ادھر توجہ نہیں کی ہے۔

بچوں کے لئے جو نصاب بنایا جائے اس میں شروع سے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ ان کی مذہبی اور قومی روح کی تربیت کرے۔ بدیسی نظام تعلیم کی بے مقصد کتابیں جن میں چوہا اور بلی کے بے جوڑ اور بے مزہ قصے ہمارے

[illegible]ں کے لئے وہ غذا فاسد ہے جو جزو بدن نہیں ہوتی بلکہ ان کے دماغی ہاضمے کو ابھی سے خراب کر ڈالتی ہے اور ہم نے بار بار کہا ہے کہ بے مقصد تعلیم قومی زندگی اور ملی حیات کے لئے ایک ذرہ کارآمد نہیں۔

ہم ترکوں کو ملحد کہنے کے عادی ہیں لیکن بہر حال انھوں نے اتنا پورے یقین کے ساتھ سمجھ کر طے کر لیا ہے کہ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے تو با مقصد قوم ہو کر زندہ رہنا ہے چنانچہ اسی لئے انھوں نے اپنے سیاسی انقلاب کے ساتھ تعلیمی انقلاب کو ضروری سمجھا ہے۔ امریکہ کے ایک مشنری رسالے "مسلم ورلڈ" نے ترکی ابتدائی تعلیم کی ریڈروں سے ایک سبق نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے:-

> "مذہب اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے پیغمبر صلعم پر ایمان لایا جائے جنھوں نے ہم کو اسلام کی تعلیم دی۔ ہم اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلعم پر عقیدہ رکھنے کو ایمان کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس نے کل کائنات اور ہم کو پیدا کیا قدرت والا ہے ہم پورے طور سے یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے یا کیونکر ہے، وہ بہت بڑا ہے ......

بچو! تم دیکھتے ہو کہ ایمان لوگوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے اور ان کو قوت اور مسرت بخشتا ہے، اللہ تعالیٰ پیغمبر صلعم اور مذہب اسلام پر عقیدہ رکھنا مذہبی ایمان ہے۔

ہمارا ایک قومی ایمان بھی ہے ہم ترک ہیں۔ ترک تہذیب یافتہ اور متمدن

ہیں۔ ہمارا ملک ہمیشہ ترقی کرتا جائے گا اور ہمیشہ دشمنوں پر فتح یاب ہوگا۔ جس وقت ترک کا نام لیا جاتا ہے، میرا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے اور میرا سر بلند ہو جاتا ہے۔ میں ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو میری قوم اور میرے ملک کے لئے مفید ہیں، جو میرے محبوب ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں ان سے مجھے مطلق محبت نہیں۔"

اوپر کے اس ابتدائی سبق پر غور کیجئے کہ ترک مدبروں نے تعلیمی حقیقت کا پتہ کس طرح پا لیا ہے اور دین و وطن کے دو گونہ جذبات کو باہم کس طرح ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو قوموں کی ان کی منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

اخلاق کی تعمیر تعلیم کا دوسرا حقیقی مقصد اخلاق کی تعمیر ہے۔ مذہب اور فلسفہ دونوں نے اس کو اصولاً مان لیا ہے کہ انسان بہت سی باتوں میں مجبور ہونے کے باوجود اپنے ارادے اور نیت کی آزادی بہر حال رکھتا ہے اور یہی آزادی اس کی ذمہ داریوں کی بنیاد ہے۔

غریبِ کشمکشِ جبر و اختیار ہیں ہم

لیکن انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوقات اس کشمکش کے اختیار سے بھی محروم ہیں اور ان میں سے ہر ایک یا تو اپنی جبلت یا اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور محض ہے اور ان لوازم خصائص اور اثرات کی بجا آوری پر مضطر ہیں جن کے لئے ان کی خلقت ہوئی۔ آفتاب سے نور ہی ظاہر ہوگا، گلاب سے خوشبو ہی نکلے گی اور مکھیاں

موت ہی صادر ہوگی۔ مگر انسان سے نور اور تاریکی، خوشبو اور بدبو، حیات اور ممات دونوں صادر ہوسکتی ہیں، اس کے اخلاق اور خصائل تربیت پذیر ہیں اور اسی لئے وہ تعلیم و تربیت کا محتاج ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ کائنات کی ہر مخلوق فطرتاً اسی کام کے کرنے پر مجبور ہے جس کے لئے اس کے خالق نے اس کو پیدا کیا ہے لیکن انسان تھوڑا اختیار پاکر فعل اور ترکِ فعل کے درمیان ترجیح کا حق رکھتا ہے، اس لئے ضرورت اس کی پیدا ہوتی ہے کہ وہ پہلے ان اغراض کو سمجھے جن کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے اور پھر ان کی اغراض کے مطابق اپنے کام کو پوری مستعدی اور دیانت داری سے انجام دے۔ خلقت کے صحیح اغراض کے سمجھنے کا نام "تعلیم" ہے اور ان کے مطابق عمل کرنے کا نام "تربیت" ہے اور ان تربیتی اعمال کا نام "اخلاق" ہے۔ تعلیم کی بڑی غرض و غایت یہ ہے کہ ان اخلاق کی صحیح تعمیر کی جائے تاکہ وہ فرائض بخوبی ادا ہوں جن کے لئے وہ اس دنیا میں آیا یا بھیجا گیا ہے۔

ہماری موجودہ تعلیم جس طرح بے مقصد ہے اسی طرح یہ تمام تر بے اخلاق بھی ہے۔ ملک میں مسلمانوں کی ایک درسگاہ بھی ایسی نہیں ہے جس نے اخلاق کی تعمیر اور تربیت کی اہمیت کو سمجھا ہو اور جس نے اپنی زندگی کا مقصد "با اخلاق انسان" کا پیدا کرنا قرار دیا ہو اسی لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عزت ہماری نگاہوں میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے کہ نئی تعلیم کی درسگاہوں میں یہ پہلی درسگاہ ہے جس نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور

اس کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے ۔

عموماً اخلاق کے معنی ہماری زبان میں نہایت محدود ہیں ۔ اخلاق کے لفظ سے ہمارا مقصود یہی محدود نہیں بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر وسیع ہے ۔ اخلاق سے مقصود انسان کی قوتِ نفسی کی ایسی تربیت اور مشق ہے جس سے وہ اپنے شخصی، انسانی اور قومی فرائض کے ادا کرنے کی پوری استعداد اور صلاحیت پیدا کر لے، درسگاہ کا اہم فرض یہ ہے کہ اپنے احاطے کے اندر ایسی فضا اور ماحول پیدا کرے جو دنیا کی فاسد اور مسموم آب و ہوا سے محفوظ ہو کر صالح اور صحیح اور طاقت ور آب و ہوا کی جگہ ہو ۔ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ اخلاقی حیثیت سے درسگاہ ایک قسم کا سینی ٹوریم یعنی دار الصحت ہے جہاں فاسد جراثیم ہلاک ہو کر بیمار صحیح و تندرست ہو جاتا ہے ۔

ہمارے گھروں کی اخلاقی اور مزاجی کیفیت جس درجہ خراب اور فاسد ہے، اسی نسبت سے اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ ہماری درسگاہوں کا ماحول زیادہ صالح صحیح اور طاقت بخش ہو تاکہ گھروں کی مسموم فضا سے علیحدہ ہو کر رفتہ رفتہ ان افراد کی تخلیق ہو جو صحیح شخصی، انسانی اور قومی اخلاق و خصائل کے حامل ہوں اور اس طرح ایک دن وہ آئے کہ پوری قوم ان اخلاق و فضائل سے متصف اور مزین ہو جائے ۔

۱ ۔ سادگی اور صفائی

ہماری درسگاہوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو سادہ لیکن صاف ستھرا رہنے کی اہمیت ذہن نشین کریں ۔ صاف ستھرا رہنے کے معنی بیش قیمت کپڑے، اعلیٰ درجے

کے مکان اور قیمتی فرنیچر اور سامان کے نہیں ہیں۔ افسوس ہے کہ اکثر مسلمان بچوں نے اس کے یہی معنی سمجھے ہیں، اس کے دو بڑے نتیجے کھلے طور سے ہمارے بچوں میں پیدا ہیں ایک یہ کہ وہ اپنی اندرونی صفائی کے بدلے ظاہری ٹیپ ٹاپ پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اس بنا پر ان کی تعلیمی زندگی نہایت گراں ہے اور وہ اپنے والدین کے لئے سراسر کوفت بنے ہوئے ہیں۔ دوسرے خود طالب العلم بھی اپنے حوصلے کے مطابق اپنی آمدنی نہ پاتے سے ملول و غمگین رہتے ہیں جس کا اثر ان کی طبیعت کی تیزی اور ذکاوت پر بہت برا پڑتا ہے اور ان کا جو وقت اپنے تعلیمی مسائل اور مباحث کے یاد اور حل میں صرف ہوتا وہ ان کے بناؤ سنگار میں اور جو نہیں ہے اس کے حصول کی فکر اور ناکامی کے غم میں بسر ہوتا ہے۔

ہمارے طالب علموں کی زندگی سادہ لیکن صاف ستھری ہونی چاہئے۔ ان کو شروع ہی سے یہ بتانا چاہئے کہ تمھاری عزت تمھارے بیش قیمت کپڑوں اور اعلیٰ سامان سے نہیں بلکہ تمھارے بیش قیمت علم اور اعلیٰ اخلاق سے ہے۔ طالب علموں کے اندر بڑائی اور مسابقت کا معیار ظاہری نمائش اور آرائش کا سامان نہ ہو بلکہ اندرونی لیاقت اور قابلیت کا جوہر ہو۔

مسلمان طالب علموں کو جو مسرت اور نمائش پسند قوم کے افراد ہیں خصوصیت کے ساتھ یہ بات جتانی چاہئے کہ اب وہ وقت نہیں کہ ہم اپنے اسلاف کے بقیہ متمولانہ اثرات کی پیروی میں وہ گراں نمائشی زندگی اختیار کریں جو ہم کو اپنے والدین سے ورثے میں مل رہی ہے کیونکہ وہ دولت ختم ہو چکی اور وہ تمول اب سراب ہے اس لئے اس کے نمائشی فخر و غرور

کے اسباب کو بھی اب ختم ہو جانا چاہئے ورنہ یہ تعلیم ہمارے افلاس میں روز بروز اضافہ کرتی جائے گی اور قوم کی حالت ہر روز بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔ اس کی مثالیں آج بہت سے خاندانوں میں ملیں گی کہ نئی تعلیم کی اس غلط تربیت نے ان خاندانوں کی مالی حالت کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔

دنیا کے دوسرے ملکوں سے بہت بڑھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کو اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے کہ وہ ایسی قوم کے دوش بدوش چلنے پر مجبور ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں حد درجہ کفایت شعار اور سادہ واقع ہوئی ہے، اس لئے اس کے ذاتی اور قومی مصارف ہمارے مقابلے میں بہت کم ہیں، بنابریں اس کے پاس ہمارے مقابلے میں دولت کی فراوانی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ جس خرچ میں ہم اپنے ایک بچے کو تعلیم دلا سکتے ہیں ہمسایہ قوم اپنے چند بچوں کو تعلیم دلاتی ہے پھر دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے فضول کاموں کے لئے اپنے بزرگوں کی متروکہ جائدادوں کو قرض میں رہن رکھ کر بیچنے پر اور وہ اس کے خریدنے پر مجبور ہیں۔

آج کل عام طور سے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ ہماری درسگاہیں اپنی عمارت، اپنے سامان اور اپنے انتظامات میں بیش از بیش نمائش پسندی میں مبتلا ہیں۔ ہماری گذشتہ تعلیم کے عہد میں ہماری مسجدیں، ہمارے تعلیمی کمرے اور ہال اور مسجد کا فرش ہماری میزیں اور بنچیں اور کرسیاں تھیں، صرف انھیں دو مدوں کی کفایت کا اندازہ موجودہ گراں طریقہ تعلیم سے بکسانی کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہماری بہتر سے بہتر درسگاہ بہتر سے بہتر

مقصدوں کے ساتھ قائم ہوتی ہے لیکن اس کے بانیوں کی ساری محنت زمین، اینٹ اور چونے پر صرف ہو کر رہ جاتی ہے اور ان مبادی سے نکل کر غایت تک پہنچنا محال ہو جاتا ہے۔

ہمارے دار الاقاموں میں سب سے بہتر دار الاقامہ وہ سمجھا جاتا ہے جو اپنے طالبعلموں کو سب سے بہتر اور قیمتی کھانا بہم پہنچائے اور ان کے رہنے کے لئے بہتر سے بہتر سامان اور کمرے مہیا کرے حالانکہ یہ تمامتر ہمارے پچھلے تماشائے دولت کا فریبِ نظر ہے اور یہی وہ عیش و تنعم اور ناز و نعمت کی زندگی ہے جو ہماری تباہی کی تمامتر ذمہ دار ہے۔

ان سب کے بجائے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ سادگی اور صفائی ہے، ہمارے نوجوانوں نے صفائی، اچھے کپڑوں، فیشن ایبل بالوں، خوشبو، عطروں اور تیلوں کا نام رکھا ہے، حالانکہ وہ حقیقت میں گھر کی صفائی، کمروں کی صفائی، کپڑوں کی صفائی اور بدن کی صفائی کی اصلی دولت سے محروم ہیں۔ طالب علموں کو اس بات کی عادت سکھانی چاہیئے کہ وہ کیونکر اپنا کمرہ، اپنا سامان، اپنے کپڑے اور بدن کو صاف رکھیں جس سے وہ جسمانی و ذہنی صحت اور وہ صفائی اور ستھراپن جو نصف دین اور اصلی تمدن ہے حاصل کر سکیں۔

۲۔ جفاکشی

اس کے بعد وہ سب سے بڑا اخلاقی جوہر جس کے حصول پر ہندوستان میں مسلمانوں کی آئندہ زندگی موقوف ہے وہ جفاکشی ہے۔ ہم نے اسلامی اصطلاحات میں جہاد کا نام سن کر اپنی روشن دماغی کے ثبوت میں کتنی دفعہ اس سے تبرّی ظاہر کرنے کی کوشش

کی ہے۔ لیکن اے عزیزان محترم! اب وقت ہے کہ ہم جہاد کی حقیقت کو عملاً سمجھیں اور برت کر دکھائیں۔ جہاد جہد سے مشتق ہے جس کے معنی محنت اور تکلیف کے ہیں۔ حق کی راہ میں ہم جو تکلیف اٹھائیں وہ ہمارا جہاد ہے۔ دنیا کی زندگی سکون پر نہیں، دائمی حرکت پر قائم ہے۔ غلط فہمی سے ہم یہ سمجھے ہیں کہ ہم جس قدر سکون پائیں گے اسی قدر آرام اٹھائیں گے پچھلے عہد کے ایک عجمی شاعر نے کہا ہے۔

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را   دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

لیکن حقیقت میں یہ زوال پذیر قوم کا فلسفہ ہے۔ راحت کے اس عجمی تخیل کے بالمقابل فصیح عرب کہتا ہے "فی الحرکۃ برکۃ"، جس طرح بھوک کے بعد غذا کا اصلی لطف ملتا ہے اور جو آنکھیں بیدار رہی ہیں وہی خواب کی لذت سے آشنا ہوتی ہیں، اسی طرح محنت و مشقت کے بغیر آرام و راحت کا وجود ہی نہیں ہو سکتا جب تک ہماری پیشانی سے محنت کا پسینہ ہمارے پاؤں پر نہ ٹپکے گا جو روٹی ہمارے ہاتھ آئے گی وہ ہمارے احساس کے ذائقے کو بھی تسکین نہیں دے سکتی۔

سست امیروں کی پر لطف غذائیں ہی وہ جراثیم ہیں جو ان کی بیماریوں کو پیدا کرتے ہیں۔ ایک محنتی مزدور چونکہ پوری بھوک اور معدے کی پوری خواہش پر کھاتا ہے اس لئے ہر وہ کھانا جو اس کو وقت پر مل جاتا ہے، وہ اس کی قوت کا سرمایہ اور اس کی صحت کا خزانہ ہوتا ہے۔

مسلمانوں کو بچپن سے محنت کا عادی ہونا چاہئے۔ ان کی طالب علمانہ زندگی

میں یہ عادت ایسی پختہ ہو جانی چاہیے کہ وہ تمام عمر کے لئے اس دولت کو اپنے قبضہ میں کر لیں۔ تعلیم، امتحان کی تیاری، ورزش، سفر اور تعلیم کی فراغت کے بعد جس شاہ راہ زندگی کو بھی اختیار کیا جائے خواہ وہ نوکری ہو، تجارت ہو، صنعت ہو ہر ایک میں یہی جوہر ان کا بہترین رفیق زندگی ہو سکتا ہے۔ پچھلی دولت مندی کا خمار اب تک مسلمانوں پر چھایا ہوا ہے۔ ہماری درس گاہوں کا بہترین فرض یہی ہے کہ وہ مسلمان طالبعلموں کے یہ ذہن نشین کر دیں کہ اب تمہاری زندگی صرف تمہاری محنت، جفاکشی اور جانفشانی پر موقوف ہے۔ یہ دنیا ایک تلاطم خیز سمندر ہے جس سے نکل کر ساحل تک بہ سلامتی پہنچنا صرف تمہارے ہی ہاتھ پاؤں چلانے پر موقوف ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اس عرصۂ کائنات میں زندگیوں کا ایک معرکہ برپا ہے اور ہر ایک مخلوق اپنے جینے اور بڑھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ قومیں اس دوڑ میں مصروف ہیں، افراد اس مسابقت میں سرگرم ہیں، وہی زندہ اور جیتا رہے گا جو اپنی محنت اور کوشش سے اس بازی کو جیتے گا اور جس نے ہاتھ پاؤں ڈال دئے اور نرم بستر کا جویا ہوا، دنیا اس کو مردہ سمجھ کر ایک گوشے میں ڈال دے گی اور افراد اور قومیں اس کو روندتی ہوئی آگے بڑھ جائیں گی۔ زندگی کا فلسفہ صرف جہد و جہاد، محنت اور سخت کوشی ہے۔ بھوک کی برداشت، شکم سیری کا سامان ہے اور موت کی تلاش زندگی کا سرچشمہ ہے۔ فَاُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ فَاُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ فَاُحْیٰی۔

یہ جو کچھ کہا گیا شاعری نہیں روزمرہ کی حقیقت ہے۔ طالب علموں کو اپنے روزانہ

کے ورزشی کھیلوں میں کیا یہ ازہر شام کو علانیہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہی لڑکا جیتتا اور وہی فریق کامیاب ہوتا ہے جو جس قدر اس دن زیادہ محنتی اور زیادہ جفاکش تھا۔ یہ پوری دنیا ایک بڑے ورزشی کھیل سے بڑھ کر نہیں۔ اس میدان میں بھی اسی کی جیت ہے جو زیادہ جفاکش ہے، کامیابی کی راحت انھیں کے لئے ہے جو اپنے کاروبار میں محنت اور جدوجہد کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔

تمام قوموں میں سب سے زیادہ کامیاب، سب سے زیادہ خوش قسمت اور سب سے زیادہ قابل رشک وہ قوم سمجھی جاتی ہے جس کے ہاتھوں میں دوسری قوموں کی سلطنت کی باگ ہو لیکن کیا تاریخ کے اوراق نے اس حقیقت کو آپ پر منکشف نہیں کیا کہ یہ کامیابی، یہ خوش قسمتی اور یہ قابل رشک ہونے کی صلاحیت اس کو کتنی محنت، کتنی جفاکشی اور کتنی پے در پے جسمانی تکلیفوں اور اذیتوں کی برداشت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ محمود نے سترہ حملوں میں پنجاب پر قبضہ پایا، شہاب الدین غوری نے ایک شکست کے بعد پورے سال بھر اپنے شکست کے وقت کے پہنے ہوئے کپڑوں کو تبدیل نہیں کیا، بابر نے کابل پندرہ برس پہاڑوں سے سر ٹکرایا۔ میں نے ان فقروں کو ہمیشہ کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ بدر و حنین کی سختیوں کو جھیلے بغیر قیصر و کسریٰ کے تخت سلطنت کی خواہش حماقت ہے۔ جس کو لال قلعے میں شاہجہاں کے تخت طاؤس پر جلوس کی ہوس ہو اس کو پہلے بابر کی طرح خشک پہاڑیوں میں سر مارنا چاہئے۔ کوہ کنی کے بغیر "جوئے شیر" کا خواب دیکھنا دیوانگی ہے۔

آج یورپ کی قومیں دنیا کے طول و عرض میں سلطنت کا تخت بچھائے کوس لمن الملک بجا رہی ہیں لیکن اپنے سپاہیوں کے کتنے خون، اپنی دولت کے کتنے صرف اور اپنی محنت و جانفشانی کے کتنے مظاہرے کے بعد یہ سعادت ان کو نصیب ہوئی ہے۔ آج تجارتوں، صنعتوں اور کاریگروں کی زندگی ہے۔ یہ زندگی کتنی زندگیوں کی قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہے، کروڑوں مزدور کان کنی میں لگے ہیں، لاکھوں آلات کے بنانے اور چلانے میں مصروف ہیں، لاکھوں دن رات دوڑ دھوپ اور محنت اور تگاپو میں مصروف ہیں تب جا کر ان کی قوم کے سر پر سلطنت کا تاج ہے اور ان کے خزانوں میں معدنیات تجارت اور صنعت و حرفت کی دولت ہے۔

بابر سے لے کر عالمگیر اول تک اور پھر بہادر شاہ اول سے لے کر بہادر شاہ ثانی آخری مغل بادشاہ دہلی تک کی زندگیوں پر غور و فکر کی نظر ڈالئے۔ کیا تین سو برسوں کی یہ تاریخ یہ حقیقت نہیں بتاتی کہ جنھوں نے تکلیف کی زحمت اٹھائی انھوں نے تخت سلطنت پر آرام کیا اور جنھوں نے آرام کی خواہش کی انھوں نے عمر بھر زحمتوں اور تکلیفوں میں بسر کی۔

الغرض مسلمان طالب علموں کو یہ نکتہ اب کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ محنت اور جفاکشی ہی کی عادت وہ چیز ہے جو ان کی تعلیمی اور علمی دونوں زندگیوں میں ان کو کامیاب بنا سکتی ہے۔ جہاں قومی سلطنتیں اور قومی تعلیم گاہیں ہیں وہاں کے نظام تعلیم پر ذرا غور کرنے سے یہ نکتہ حل ہو سکتا ہے کہ ان کے نصاب تعلیم میں جو اہمیت کتابوں

کو حاصل ہے اس سے کم اہمیت ان کے جسمانی کھیلوں اور مختلف ورزشوں کو حاصل نہیں ہے۔ میدانی کھیلوں کے علاوہ پہاڑوں پر چڑھنا، دریاؤں میں کشتی چلانا، دھوپ میں دوڑنا، ہواؤں میں اڑنا وہ کونسی جانفشانی ہے جس کی مشق یہ قومیں اپنے حکمراں بننے والے افراد کو نہیں کراتیں۔ انگلستان کی بہترین درسگاہوں کے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور یہ نظر آیا ہے کہ ان ورزشی کھیلوں کی اہمیت وہاں تعلیم کے برابر ہی برابر ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہاں کی عام تعلیم گاہیں بھی تقریباً نیم فوجی ہیں۔ اسی سے ہندوستان کی تعلیم کا یہ نقص کہ وہ تمام تر نظری رہتی ہے، عملی نہیں وہاں دور ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اگر آئندہ ہندوستان کی سلطنت میں حصہ لینا ہے تو ان کو یہ نکتہ فراموش نہ ہونا چاہئے کہ آئندہ ان کو صرف نظری نہیں بلکہ عملی قوم بننا چاہئے اور یہ اخلاقی تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔

۳۔ خود اعتمادی

مسلمانوں کی اخلاقی تعمیر کا نہایت اہم عنصر اپنے افراد کے اندر خود اعتمادی کا جوہر پیدا کرنا ہے جس کے بغیر نہ کوئی شخص کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ کوئی قوم۔ خود اعتمادی سے مقصود اپنے اندر فیصلے کی قوت سے مستحکم عزم پیدا کرنا اور پھر اس عزم کے مطابق خدا کے بعد خود اپنی ذات پر بھروسہ کر کے کام شروع کر دینا اور اس کو کامیابی تک پہنچانا ہے۔ قرآن پاک نے اس نکتے کو صرف دو لفظوں میں ادا کیا ہے "اِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ" (جب عزم کرلے تو پھر خدا پر بھروسہ کر) اس سے پہلے مشورے کا حکم ہے۔ مشورے کے بعد جو فیصلہ ہو جائے اس پر مستحکم عزم کی تاکید ہے، پھر اس عزم کے مطابق اس کو

کرگذرنا اور اس کی کامیابی کے لئے خدا کی توفیق اور نصرت پر بھروسہ رکھنا۔

مسلمانوں کا یہی جوہر تھا جس سے متصف ہو کر ایک غریب مسافر ہمت کی کمر باندھ کر تن تنہا کھڑا ہوتا تھا اور بحر و بر، دشت و جبل کو طے کر کے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کو چلا جاتا تھا۔ ایک یتیم طالب العلم گھر سے یکہ و تنہا نکلتا تھا اور سالہا سال تک ملک ملک کی خاک چھان کر ایک ایک شہر میں علم و فن کے ماہرین وقت کی صحبتوں اور درسگاہوں سے فیض پاکر اپنے وطن کو لوٹتا تھا، ذرہ ہو کر نمودار ہوتا اور پھر آفتاب بن کر چمکتا تھا۔ ایک باہمت سوداگر اکیلا اپنا ساز و سامان لے کر کبھی سندباد بحری اور کبھی سندباد بری بن کر نکلتا اور دولت کے جہاز اور کارواں سے لدا پھندا عراق، شام، اسکندریہ اور اسپین کی بندرگاہوں میں اترتا۔ ایک معمولی سپاہی اپنی تلوار لے کر نکلتا اور روئے زمین کی فضا کو چیر کر کہیں نہ کہیں اپنے لئے ایک حکومت و ریاست کھڑی کر لیتا۔

مسلمانوں کا یہ جوہر اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں ان سے کھو گیا۔ سن کر حیرت ہو گی کہ وہ بابر جس نے پندرہ برس کے سن میں تخت پر بیٹھ کر اور پھر بارہ ہزار کی فوج سے ہندوستان کو فتح کر ڈالا۔ اس کی اولاد جب لال قلعے سے بھیڑ کی طرح نکلی ہے تو اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کس طرح اپنے ہاتھوں سے اپنی روزی کا سامان کیا جا سکتا ہے۔

والدین اپنے بچوں کے ساتھ اپنی بہترین محبت یہ سمجھے ہیں کہ تنہا کوئی کام کرنے نہ دیں، تنہا راستے میں نہ چلیں، راتوں کو اکیلے گھر سے باہر نہ نکلیں، کمروں میں رات کو تنہا سونے نہ پائیں۔ ایک بڑے عالم باپ کو میں نے دیکھا کہ اپنے جوان بیٹے کو

کالج کی تعلیم کے لئے لکھنؤ اس لئے نہیں جانے دیتے تھے کہ یہ کالج میں پڑھنے جانے والا بچہ کہیں آتے جاتے راستے میں موٹروں سے کچل نہ جائے۔ امیر مسلمانوں کے گھروں میں یہ بات دولتمندی کی نشانی سمجھی جاتی ہے کہ انائیں اور کھلائیاں جوان جوان لڑکوں سے بھی علٰحدہ نہ ہونے پائیں۔ اٹھارہ انیس سال کے ایسے نواب زادوں کے واقعے سنے ہیں جن کو اس وقت تک نیند نہیں آتی تھی جب تک ان کی انا بی بی ان کو پلنگ پر سلاتی نہ ہوں، آپ نے ایسے نواب زادوں اور امیر زادوں کو دیکھا ہوگا جو کسی درسگاہ کے دارالاقامے میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ ان کو ناگہانی آفات سے بچانے کے لئے اسٹاف کا اسٹاف ہوتا ہے۔

غریب مسلمانوں تک میں یہ بات عموماً دیکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو خود تنہا اپنے کام کی ذمہ داری اٹھانے کی زحمت دینے پر بہت کم رضامند ہوتے ہیں، یہی سبب ہے کہ ہمارے بچے عزم وارادے کے کچے، ہمت کے بودے اور استقلال کے کمزور ہوتے ہیں اور اس لئے تعلیم کے زمانے کے اندر اندر بھی وہ آتالیق اور ٹیوٹر کے سہارے کے بغیر نہیں چل سکتے اور تعلیم کے بعد بھی اپنے بل بوتے پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ الغرض وہ بچپن میں انا اور کھلائی کے، تعلیم میں آتالیق اور ٹیوٹر کے اور ملازمت میں سعی و سفارش کے محتاج ہوتے ہیں، زندگی کے ہر ہر مرحلے میں ہر قدم پر ان کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلیں۔ ایسی قوم کے افراد کیا حکومت کی بلند چوٹی پر چڑھنے کی ہمت کر سکتے ہیں؟ کیا اسلامی ہندوستان کی تاریخ ہمارے سامنے نہیں۔ ان کی ترقی

کا عہد تھا جب بادشاہ کے زیر سایہ امرا کھڑے ہو کر ملک کا انتظام کرتے تھے اور ان کے تنزل کا زمانہ جب آیا تو یہ شہزادے اپنے اپنے امیروں کے سہارے کھڑے ہو کر تخت پر بیٹھنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان امیروں نے ان کو اٹھا کر تخت سے دور پھینک دیا اور بالآخر تخت اور تخت نشین دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔

یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کے افراد میں آج یہ جوہر ان کی انھیں درسگاہوں میں پیدا ہوتا ہے اور اسی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جس پرزے کو جہاں لگا دیجئے وہیں وہ کام دینے لگتا ہے۔ ایک فرنچ مصنف نے اینگلو سیکسن قوم کی ترقی کے راز پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ عربی میں ”سر تقدم الانکلیز السکسونیین“ کے نام سے ہوا ہے۔ اس میں زیادہ زور اسی بات پر دیا گیا ہے کہ انگریز قوم کی ترقی کا بڑا راز یہی خود اعتمادی کا جوہر ہے۔ ایک اور فرنچ نے ”بیسویں صدی کا امیل“ کے نام سے خطوط کی صورت میں ایک کتاب لکھی ہے؛ اس میں بھی بڑی خوبی سے یہ دکھایا گیا ہے کہ ماں کی گود سے لے کر کالج کی اعلیٰ تعلیم تک لڑکوں میں جس وصف کے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے وہ خود اعتمادی ہے۔ ایک انگریز سپہ سالار کا یہ فقرہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہم نے انگلستان کے فٹ بال کے میدانوں میں خود اعتمادی اور ثبات و استقلال کا جو جوہر اپنے اندر پیدا کیا تھا وہی نپولین کے مقابلے میں ہمارے کام آیا۔

مسلمان ہندوستان میں جس تعدادی اقلیت میں ہیں اس کی تلافی صرف ان کی اخلاقی قوت اور علمی طاقت سے ہو سکتی ہے، اس لئے ہماری درسگاہوں کو اس

ملک کے مسلمانوں کو آئندہ زندگی بخشنے کے لیے ضرورت ہے کہ وہ اپنے طالب علموں میں یہ قوت اور یہ طاقت پیدا کریں تاکہ وہ اپنے استحقاق سے اس ملک میں زندہ رہ سکیں اور اس مملکت کے نظام حکومت کے قیام اور استواری میں کسی طرح ان سے حکومت وقت کو بے نیازی نہ ہو سکے۔

اساتذہ   ہماری درسگاہوں میں جس چیز کی طرف سب سے کم توجہ کی جاتی ہے وہ استادوں کے انتخاب کا مسئلہ ہے۔ قومی درسگاہوں میں اس انتخاب کا معیار یہ ہے کہ جو کم تنخواہ لے اور سرکاری درس گاہوں میں یہ کہ جو سب سے اونچی کاغذی سند رکھے اور "یورپین کوالیفیکیشن" تو وہ منتر ہے جس سے ہر تعلیمی بھوت بآسانی بھاگ جاتا ہے۔ ہندوستان کا کیسا ہی تجربہ کار سے تجربہ کار، ماہر سے ماہر اور محقق سے محقق ہو لیکن اگر اس کے پاس یورپ کی کسی درسگاہ کے دو لفظ نہ ہوں تو اس کے مقابلے میں بیرونی تعلیم کا ہر ناتجربہ کار اور نوآموز ترجیح پائے گا، ہماری بڑی سے بڑی یونیورسٹی آج انگریز، فرنچ اور جرمن استادوں کے ناموں کے جادو میں گرفتار ہے اور اس کی منہ مانگی تنخواہ دینے میں حاتمانہ فیاضی کے لئے تیار ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک ہم نے اپنی تعلیم کا کوئی نصب العین مقرر نہیں کیا ہے بلکہ خود قوم نے بھی اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار نہیں دیا ہے، اس لئے استادوں کے انتخاب کا معیار صرف یہ رہ گیا ہے کہ اعلیٰ سند کا کاغذ اور سات سمندر پار کے حکمراں اقوام کی گوری شخصیت، انتہا یہ ہے کہ عربی، فارسی اور تصوف کے پڑھانے کے لئے بھی ہم

اپنی قوم کے کسی فرد پر اعتبار کرنے کے لئے اس وقت تک تیار نہیں جب تک پروفیسر مارگولیتھ، پروفیسر براؤن، ڈاکٹر آرنلڈ اور ڈاکٹر راس کے دستخطوں کا کاغذ اس کے پاس نہیں۔

ہم نے اس سے پہلے مسلمانوں کے تعلیمی مقاصد کا جو خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے اگر وہ ذہن نشین ہے تو آپ اس کا فیصلہ کرنے میں ایک ذرہ بھی تامل نہ فرمائیں گے کہ اُستادوں کے انتخاب کا معیار کاغذی سند سے بڑھ کر ان کی شخصیت میں ان مقاصد کا وجود ہے جن پر اس تعلیم گاہ کی بنیاد قائم ہے۔ اگر آپ کسی ایسی دو درسگاہوں کا باہم موازنہ کریں جن میں سے ایک ایسے استادوں کا اسٹاف رکھتی ہے جو اعلیٰ کاغذی سندوں کے تو مالک ہیں مگر ان مقاصد سے سرتاسر خالی ہیں اور دوسری گو اعلیٰ کاغذی سندوں کے لحاظ سے کم درجہ ہے مگر اس کے استاد اپنے اندر وہ جوہر رکھتے ہیں جو اس کے تعلیمی مقاصد کا حقیقی عنصر ہیں تو یقیناً علمی حیثیت سے دوسری پہلی سے کہیں زیادہ مفید ہوگی۔ کیا ہماری نئی اسلامی درسگاہیں استادوں کے انتخاب کے وقت یہ معیار اپنے سامنے رکھتی ہیں کہ ان میں سے کون زیادہ مسلمان، کون زیادہ راستباز، کون زیادہ مخلص، کون زیادہ محنتی، کون زیادہ جفاکش اور کون حقیقت میں مسلمانوں کے تعلیمی نصب العین کے پورا مطابق ہے؟ کیا کسی غیر قوم کے استاد سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ دوسری قوم کے حقیقی تعلیمی نصب العین کے مطابق اپنے کو بنائے گا اور خود اس کا نمونہ بن کر طلبہ کے سامنے آئے گا؟ ایسے استادوں کے زیر تعلیم و تربیت جن میں سے ہر ایک کا قبلہ مقصود صرف دوسری قوم کی ظاہری نقالی ہو اور جن کا حوصلہ صرف سوٹ، کوٹھی، فرنیچر اور موٹر تک

محدود ہو، ایسے لڑکوں کے پیدا ہونے کا خواب دیکھنا جو مسلمان ہوں، قوم پرور ہوں، سادہ ہوں، جفاکش ہوں اور مسابقت اقوام کی دوڑ میں اپنی برتری دکھا سکیں، کہاں تک حق بجانب ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی احمق کاشتکار اپنے کھیتوں میں جو بو کر گیہوں کاٹنے کی امید رکھے اور اس سے بے خبر ہو کہ ع گندم از گندم بروید جو ز جو۔

اسلامی اور وطنی نصب العین کا جو خاکہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے اور جس کو مسلمان اپنا قومی مقصد اور زندگی کا مطلوب بنا لیں وہی درحقیقت استادوں کے انتخاب کا معیار ہے۔

بوریا باف گرچہ بافندہ است   نہ برندش بہ کارگاہ حریر

ہماری پچاس برس کی تعلیمی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تو اپنا کوئی تعلیمی مقصد متعین نہیں کیا اور نہ اس مقصد کے مطابق اپنے استادوں کا انتخاب کیا۔ مثال دیتا ہوں، ہم نے عربی پڑھانے کے لئے یورپ کے ایک بہترین مستشرق کو بلوایا وہ عربی فیلالوجی اور یوروپین عربی مطبوعات و مخطوطات کی پوری فہرست ہمارے بچوں کو رٹا سکتا ہے، مگر قرآن پاک کا وہ شغف اور تاریخ اسلام کا وہ ذوقِ قومی ہم کو کیوں کر عطا کر سکتا ہے جو نہ صرف یہ کہ اس کو نصیب نہیں بلکہ وہ اس سے منحرف ہے۔

ہماری اکثر درس گاہوں کے استاد صرف پیشہ ور معلم ہیں جنھوں نے اس پیشے کو صرف اس لئے اختیار کیا ہے کہ یہ بھی معیشت کا ایک ذریعہ ہے ورنہ درحقیقت وہ ہمارے قومی مقاصد، تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے سراسر محروم ہیں اور

پھر ان سے ہم یہ احمقانہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آئندہ ہمارے بچوں کو ہمارے قومی مقاصد، تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے بہرہ ور کر دیں گے۔

جامعہ ملیہ کو میں مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے اپنے استادوں کے انتخاب میں اس نکتے کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس نے انتخاب کا معیار اعلیٰ کاغذی سند کو نہیں بلکہ اپنے تعلیمی مقاصد کو رکھا ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر اس درس گاہ میں ایک نہایت اعلیٰ قسم کے ایسے استاد کو لا کر رکھ دیا جائے جو گو یورپین استاد کا بڑا پوٹ اپنے قبضے میں رکھتا ہو مگر اس کے تمام تر حالات و خیالات اور نشر و تعلیم ان مقاصد کے خلاف ہوں جن پر اس درس گاہ کی بنیاد ہے تو کیا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اس کو "جامعہ بدر" کرنے میں ایک لمحے کے لئے بھی اس کے فضل و کمال کے ان کاغذی دستاویزات کا پاس کریں گے؟ پھر کیا یہ کہ ہماری درسگاہوں کے معلم اپنے وجود، اپنی تعلیم اور اپنے فیض صحبت سے علانیہ ہمارے قومی مقاصد کی تضحیک، ہمارے مذہبی خیالات کی توہین اور ہمارے وطنی اغراض کی تکذیب کرتے ہیں اور پھر صرف اس لئے یہ گوارا کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس کاغذی دستاویزات کا اچھا ذخیرہ موجود ہے۔

جوہر طینت آدم ز خمیر دگر است   تو توقع ز گلِ کوزہ گراں میداری

ارکان جامعہ سے بھی ایک بات کا برملا اظہار کر دینا ہے۔ ہم نے اب تک جامعہ ملیہ کو اسلامیت اور وطنیت جدید اور قدیم دونوں کی لطیف و معتدل آمیزش کا نتیجہ سمجھا ہے۔ اس لئے اساتذہ کے انتخاب میں صرف "اخلاص و ایثار" کی سند اتنی زبردست نہیں

کہ اس کے لئے اسلامیت کی نفی کردیں، یا وطنیت سے انحراف پسند کرلیں۔ اگر وطنی اغراض کے مخالف کو اس جامعہ میں معلم نہیں باقی رہنا چاہیے، تو اسلامی اغراض کے مخالف کے لئے رواداری کیوں برتی جائے۔ اگر کوئی درسگاہ اس قسم کی رواداری برتتی ہے تو درحقیقت وہ اپنے مقاصد کی جڑ پر آپ کلہاڑی مارتی ہے۔ بہرحال اس بات کے اظہار میں ہم کو کوئی پس و پیش نہیں کہ ہماری یہ نوعمر درس گاہ اس اصول کو بہت کچھ اپنے سامنے رکھتی ہے اور دعا ہے کہ اس کے کارکنوں کو اپنے معیار کی سختی پر مزید استقامت نصیب ہو۔

علوم ہم کو اپنی درس گاہوں میں کن علموں کو پڑھنا اور پڑھانا چاہیے؟ یہ وہ سوال ہے جس پر اب تک مسلمانوں نے کیا بلکہ ہندوستانیوں نے بھی غور نہیں کیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہم ڈیڑھ سو برس سے جس تعلیمی شکنجے میں گرفتار ہیں، اس سے مجبور رہ کر ہم اس پر غور کر بھی نہیں سکتے۔ ہندوستان میں نئی تعلیم جن اسباب سے پھیلائی گئی ہے ان کو بیان کرنے میں برطانی مدبرین نے کبھی پس و پیش نہیں کیا ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے دلوں سے اپنی تہذیب و تمدن اور دین و مذہب کی عصبیت مٹ جائے۔ اس کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ نصاب تعلیم کو ہر مذہبی اسپرٹ سے خالی رکھا جائے یہاں تک کہ اس میں خدا کا نام بھی نہ آنے پائے۔

(۲) بنگال کی ابتدائی مثالوں سے انگریزوں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ تعلیم عیسائیت

کی اشاعت میں معین ہوگی۔ اسی لئے گورنمنٹ کی طرف سے مشنری اسکولوں کی پوری حوصلہ افزائی ہوئی اور ان میں انجیل کی تعلیم داخل کی گئی۔

(۳) انگریزوں کو اپنی حکومت کی تنظیم میں ایسے ماتحتوں کی ضرورت تھی جو ان کے دفتروں کے لئے کچے مواد اور مسالوں کو ان کے مطالعہ تجزیہ اور فیصلے کے لئے مرتب کر سکیں اور ان کو ان کی زبان میں معاملے کی صورت حال کو سمجھا سکیں۔

ان وجوہ سے جدید درسگاہوں کو پہلے تو مذہبی اور اخلاقی تعلیم سے یکسر خالی رکھا گیا پھر ان میں صرف انھیں علوم کو داخل کیا گیا جو اس قسم کے ادنی تعلیم یافتوں کو ان کے لئے مہیا کر سکے۔ ایسے محرروں، کلرکوں اور ماتحت افسروں کو سب سے پہلے تو انگریزی جاننا چاہیئے تاکہ وہ ان کی زبان میں سلطنت کے معاملات اور کاغذات کو پیش کر سکیں پھر ان کو حساب جاننا چاہیئے جو ان کے دفاتر کے حساب وکتاب کو درست رکھ سکیں۔ چنانچہ جو نئی تعلیم ہندوستان میں جاری کی گئی، اس کی اصلی بنیاد یہی دو چیزیں ہیں: انگریزی اور حساب، اس کے ساتھ تیسری چیز جغرافیہ ہے جس سے مقصود صرف اس قطعۂ ارض کا علم ہے جہاں سے آفتاب کبھی نہیں ڈوبتا، اور اس سے اس سلطنت کی وسعت اور عظمت کے ساتھ اس کے مختلف ٹکڑوں کا جوڑ بھی معلوم ہو۔ چوتھی چیز تاریخ ہے جس کا مقصد اس ملک کی قوموں کے باہمی دشمنانہ تعلقات کی یاد کو ان کے دلوں میں تازہ رکھنا اور انگریزوں نے جیسا کہ وہ کہتے ہیں اس ملک میں ایک نظم عادل اور متمدن حکومت قائم کر کے اہل ملک پر جو احسان کیا ہے اس کو بار بار دہراتے رہنا ہے۔ چنانچہ حکومتِ وقت

اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئی اور اس نے ہندو مسلمانوں کے درمیان بغض و عداوت کی وہ آگ بھڑکا دی جو ہماری بہترین کوششوں کے باوجود اب تک نہ بجھ سکی۔

اعلی تعلیم کے دو حصے ہیں۔ فنون یعنی آرٹس اور علوم یعنی سائنس۔ یہ دونوں حصے حد درجہ ناقص ہیں، آرٹس میں جن فنون کی تعلیم دی جاتی ہے ان کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ سلطنت کے لئے ماتحت افسر حاصل ہوں۔ ابھی حال میں پٹنہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر کورٹنی ٹیرل نے پٹنہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں جو خطبہ پڑھا اس میں انھوں نے یہ بالکل بجا کہا ہے:-

"بی اے یعنی بیچلر آف آرٹس، کس قدر مغالطہ آمیز فقرہ ہے۔ وہ کون سا آرٹ ہے جس میں ایک بی اے مہارت حاصل کرتا ہے"

سے شے کر ایک تاریخ، دوسری انگریزی اور تیسری پولیٹکل اکانمی جس کی مناسبت قانون خوانی اور وکالت کے خیال سے ہے، اور پھر نظری فلسفہ۔ علوم میں ایک عجیب ندرت یہ رکھی گئی ہے کہ "نظریات" کو اہمیت دی جائے اور "عملیات" سے پہلو تہی کی جائے۔ ہماری ایک بڑی درس گاہ یعنی سائنس کالج کی سب سے بڑی اہمیت علم حیوانات کی تعلیم ہے حالانکہ ہم ابھی علم انسان سے بھی آشنا نہیں۔ حیوانات کے خصائص اور زوجی فرائض کے علم سے بہتر ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ ان میں سے کس کا چمڑا ہم کس طرح کام میں لا سکتے ہیں۔

غرض ان بے عمل اور نظری علوم کی تعلیم سے ممکن ہے کہ موجودہ حکام تعلیم کا یہ

مقصد ہو کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنی زندگی گذانے کے لئے حکومت وقت کے دست نگر رہیں تاہم یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ جیسے جیسے یہ تعلیم بڑھتی جاتی ہے لکھے پڑھے یا ربچوں کی تعداد بھی روزافزوں ہے اور چونکہ ہندوستان میں بے کاروں کے لئے کام مہیا کرنا حکومت کا فرض نہیں اس لئے اس کو اپنے طریق تعلیم میں تغیر کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔

حکومت کی ابتدائی تعلیمی پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ہندوستان میں اور خصوصاً مسلمانوں میں تعلیم کی ضرورت صرف نوکری کے حصول کے لئے ہے اور اب انقلابات نے ہماری آنکھوں سے یہ پردہ اٹھا دیا ہے کہ یونیورسٹیوں کی یہ تعلیم نوکریوں کے حصول میں بھی اب کارآمد نہیں رہی ہے تو اب سوال یہ ہو کہ آخر پھر اسی تعلیم کے پیچھے اب تک دوڑے چلے جانا کہاں تک صحیح ہے۔ اگر اس تعلیم سے سرکاری نوکریوں کا سہارا بھی ہو تو بھی یہ سمجھنا چاہیئے کہ سرکاری نوکریاں قومی افلاس کے دور کرنے کا علاج نہیں ہیں۔ وہ علوم و فنون جو حصول دولت کے اصلی ذرائع ہیں ان کی تعلیم ہمارے نظام تعلیمات سے قطعاً خارج ہے۔ عملی کیمسٹری، آلات سازی اور صنائع و حرفت کی تعلیم جن پر قومی روزی کا دار و مدار ہے، ہمارے تعلیمی دائرے سے تمامتر باہر ہے، کہ اگر ان کی تعلیم یہاں ہو تو پھر ہندوستان انگلستان کی مصنوعات کا بازار باقی نہ رہے، ڈاکٹری ہم کو یہاں سکھائی جاتی ہے مگر دواسازی نہیں کہ اگر ایسا ہو تو پھر دواؤں کی قیمت میں ہندوستان اپنا سرمایہ انگلستان کو دینے پر کیوں مجبور ہو۔

اسکول کی پوری تعلیم میں سائنس کی تعلیم برائے نام ہی چھوئی جاتی ہے۔ جغرافیہ طبیعی، حفظان صحت اور طبیعیات کی دوسری چھوٹی چھوٹی باتوں کے سوا ان کو اور کچھ

بتایا نہیں جاتا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی لکھنے اور بولنے اور حساب جوڑنے کے سوا کچھ اور ان کو نہیں آتا کالجوں کی اعلیٰ تعلیم میں انھیں خاکوں کو اور زیادہ ابھار دیا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان مسائل پر پوری طاقت سے گفتگو کرنے کے لئے میں اپنے میں اہلیت نہیں پاتا اس لئے تفصیلات کو اپنے سے زیادہ لائق اشخاص کے سپرد کرکے صرف چند سرسری اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ کیا یہ غیر مذہبی اور غیر قومی تعلیم آئندہ جاری رہنا چاہیے؟ کیا ایسا نصاب تعلیم کے لئے زہر نہیں جو مذہب و اخلاق اور قومی تخیل کی روح سے یکسر خالی ہو؟

(۲) کیا نفس انگریزی زبان کا یہ معیار تعلیم کہ ہر ہندوستانی خالص انگریزوں کی طرح اس زبان میں لکھ پڑھ سکے اب بھی باقی رہنا چاہئے؟ یا اس قدر جاننا کافی ہے جس سے اس کے ذریعہ گفتگو کاروبار اور حصول علم ممکن ہو۔

(۳) علوم میں ان سائنسوں کو جگہ دی جائے جن سے ہم کو عملی فائدہ پہنچے اور وہ ہمارے علم کے ساتھ ہماری دولت کو بھی بڑھا سکیں۔

ہمارے بچوں کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ گھڑی سے وقت کیونکر پہچانیں، ٹکٹ لے کر ریل پر کیوں کر بیٹھیں اور ایک موٹر کا عام استعمال کیوں کر کریں، تار لکھ کر بابو کے ذریعے تار کیوں کر بھیجیں لیکن یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ ہم گھڑی کیوں کر بنائیں، لوہے کو مٹی سے کیسے نکالیں، پھر لوہے کو کیسے صاف کریں، پھر کیوں کر ریل کی پٹریاں اور گاڑیاں اور

پہیئے اور انجن بنائیں۔ موٹر کے ٹکڑوں اور ان ٹکڑوں کو کیسے بنا کر جوڑیں۔ اسی مثال پر دوسری باتوں کو قیاس کیجئے۔

ہم اب تک پوری تیزی کے ساتھ اسکول کی تعلیم کے بعد کالج کی تعلیم کی طرف دوڑتے چلے گئے ہیں اور یہ سمجھتے رہے ہیں کہ بس اس کے بعد ہم کامیابی کی منزل کو پہنچ گئے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کالج کی گراں قدر قیمت تعلیم میں ہم اپنے بچوں پر جس قدر صرف کرتے ہیں اکثر ایسا ہو رہا ہے کہ ان لڑکوں کو اس تعلیم کے بعد اتنی رقم بھی ماہوار ملنی مشکل ہے۔ ہمارے لڑکے بی۔ اے تک ایک بنی ہوئی شاہراہ پر پوری امنگ اور ولولوں کے ساتھ دوڑتے چلے جاتے ہیں اور ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سڑک کے خاتمے پر ان کو اپنی منزل کا پتہ مل جائے گا۔ مگر وہ جب وہاں پہنچتے ہیں تو دفعتہً منزل مقصود کی رفیع عمارت کے بجائے ایک عمیق غار ان کو نظر آتا ہے اور وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اب سوچتے ہیں:-

گذری جو گذرنی تھی اب چاہئے کیا کرنا

غور کرتے ہیں تو سرکاری نوکری کے سوا اپنے اندر اور کسی کام کی صلاحیت نہیں پاتے، اس سے مایوس ہو کر بعض لوگ تو ذرا کترا کر پھر آگے دوڑنا شروع کر دیتے ہیں یعنی ایم۔ اے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں اور بعض قانون یاد کرتے ہیں یا ٹریننگ کی فکر کرتے ہیں لیکن اب ٹریننگ کا دروازہ بھی بند ہو رہا ہے اور قانون کے میدان میں جو بھیڑ بھاڑ ہے اس سے کون بے خبر ہے۔

ان واقعات نے یہ غور کرنے کا موقع دیا ہے جن کو علم علم کے لئے حاصل کرنا ہے آیا ان کے لئے اس طریقۂ تعلیم میں علوم کی تحصیل کا سامان ہے اور جن کو علم کمائی کے لئے حاصل کرنا ہے کیا انھوں نے اس موجودہ طریقۂ تعلیم میں اپنی شکم سیری کا بھی کوئی فن سیکھا ہے؟

اب اس مسئلے میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ان چند لوگوں کے سوا جو علم کی واقعی تحصیل چاہتے ہیں یا علمی اور تعلیمی پیشے میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں بقیہ افراد کو صرف اسکول کی تعلیم پر قناعت کرنا چاہئے اور اعلی التعلیم کا فریب نہ کھانا چاہئے، اس تعلیم کے بعد ان کو کسی صنعت، حرفت، تجارت یا دوسرے ذرائع معاش کی طرف توجہ کرنی چاہئے اعلی تعلیم میں صرف انھیں کو جانا چاہئے جو واقعی علم کے شیدا ہوں اور تحقیق و تکمیل کے طالب ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ حکومت نے اس اعلی التعلیم کو اپنے چند بلند عہدوں کے لئے انتخاب کا معیار مقرر کر لیا ہے اور انھیں کا لالچ قوم کی قوم کو اس کی طرف کھینچ رہا ہے مگر غور کے قابل بات یہ ہے کہ یہ چند عہدے جو ہر صوبے میں دس بیس سے زیادہ نہیں، وہ ہزاروں اور لاکھوں مسلمانوں کو نہیں مل سکتے، جب چند سال کی دفتر گردی کے بعد بالآخر وہیں لوٹ کر آنا ہے تو پہلے ہی سے وہیں جانے کی تیاری کیوں نہ کی جائے؟

ہمارے ہاں تعلیم کی ایسی بندھی ہوئی اور محدود صورت اب تک ہے کہ خواہ لڑکے میں مناسبت ہو یا نہ ہو اور ان علوم سے ان کو وابستگی ہو یا نہ ہو بہر حال وہ ان کو پڑھتا ہے اور ان میں ان کو کامیاب ہوتا ہے ورنہ آئندہ وہ کسی لائن میں بھی گھس نہیں سکتے۔ اس مجبورانہ طریق تعلیم نے ہمارے طلبہ کی ذہانتوں کا اور والدین کے سرمایہ کا بے دریغ خون

کیا ہے۔ آخر قوم کی یہ ذہنی خودکشی اور مالی فضول خرچی کب تک جاری رہے گی اور کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اس موجودہ تعلیمی نظام کے خلاف ہم اپنے لئے آپ ایک منظم تعلیم کی بنیاد ڈال کر عملاً بغاوت کا اظہار کریں اور ان علوم کو چھوڑیں جن کا انتہائی مقصد عمدہ انگریزی سیکھنا ہو اور ان علوم کو اختیار کریں جن سے قومی تربیت کے بعد حصول زر کا طریقہ سیکھا جائے۔

ہم نے اس تعلیم کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے جس کا مقصد علم کا حصول ہے کہ اس کے لئے سب سے پہلی شرط پیٹ کے سوال سے آزادی ہے۔ ہم نے اب تک یہ چاہا ہے کہ علم اور پیٹ دونوں مقصدوں کو ایک تعلیم کے اندر جمع کردیں اور یہ ناممکن ہے۔ پیٹ کی تعلیم سے علم کی آسودگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے مسلمانوں میں اس نئی تعلیم کے ذریعے سے کوئی بڑا مصنف، کوئی بڑا محقق، کوئی بڑا فلاسفر، کوئی بڑا مورخ، کوئی بڑا سائنٹسٹ کوئی بڑا موجد، کوئی بڑا کیمسٹ، کوئی بڑا اسٹرانومر، کوئی بڑا میتھمیٹیشین پیدا نہیں کیا، اور اگر اتفاقاً پیدا ہو بھی گیا تو اس نے علمی زندگی نہیں پائی کیونکہ علم کی صبر آزما اور سنگلاخ راہ سے کمال کی منزل تک پہنچنے کے بجائے جھوٹی پالٹیکس اور سرکاری نوکری کے ذریعے فخر و شہرت اور نام و نمود پیدا کرنے کا راستہ ان کو زیادہ آسان نظر آتا ہے اور علم کا تقاضا ہے کہ علم کے سوا اس کے طالب کا کوئی اور مقصود نہ ہو۔

تعلیم کی زبان سب سے آخری بات تعلیم کی زبان کا مسئلہ ہے۔ میں نے ابھی مسلم یونیورسٹی کے خطبے میں اس پر اپنے مفصل خیالات ظاہر کئے ہیں جن کے دہرانے کی حاجت یہاں نہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس بدیسی زبان کی گرفت سے جو ۱۸۳۵ء میں ہم پر

سلط کی گئی آزادی حاصل کریں۔ یہ نکتہ بھلایا نہ جائے کہ ہم نے بدیسی زبان کے ذریعہ تعلیم ہونے کی مخالفت کی ہے، نئے علوم اور کسی قوم کی علمی و ادبی زبان سیکھنے کی نہیں۔ علوم و فنون خواہ کتنے ہی نئے ہوں اور کسی قوم سے ان کو نسبت ہو، وہ کسی خاص زبان کے اندر محدود نہیں۔ مسلمانوں نے ہندوستان ایران اور یونان کے سب علوم و فنون سیکھے مگر اس طرح نہیں کہ انھوں نے اپنی تعلیم کی زبان ہندی یا ایرانی یا یونانی کر دی ہو بلکہ یہ کیا کہ ان تمام زبانوں کے علوم و فنون کو خود اپنی زبان میں منتقل کیا یا دوسروں سے منتقل کرالیا اور اس اپنی زبان کے ذریعے لوگوں کو ان علوم و فنون کی تعلیم دی۔ آج اگر یورپ ہی کی تقلید کمال کی دلیل ہے تو کیا کسی پست سے پست یورپین قوم کی مثال دی جا سکتی ہے جس نے اپنی زبان کو چھوڑ کر دوسری اعلیٰ قوموں کی زبانوں کو علوم و فنون کی عام تعلیم کا ذریعہ قرار دیا ہو۔ کل بیت الحکمۃ نے بغداد میں جو کچھ کیا وہ کیا ہے، جو دارالترجمہ عثمانیہ میں آج نہیں ہو سکتا، جاپان نے انگریزی اور فرنچ کے ذریعے اپنے ہاں تعلیم نہیں پھیلائی اور نہ آج ترک تک باایں ہمہ جدت پسندی جرمن اور فرنچ کو تعلیم کا ذریعہ بنا رہے ہیں کیونکہ وہ اس نکتے کو سمجھتے ہیں کہ زبان کو قومیت کی تخلیق میں کیا اہمیت حاصل ہے۔

۱۹۲۰ء میں فرانس جب شام کو امیر فیصل سے چھین کر اس پر قبضہ کر رہا تھا تو اس وقت اتفاق سے میں فرانس کے شہر ویشی میں تھا۔ فرنچ اخبارات شام پر اپنے قبضے کی جو وجوہ بتا رہے تھے ان میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ”یہ وہ ملک ہے جہاں فرنچ زبان کے تین سو اسکول ہیں“ یہی وہ اسکول ہیں جہاں شامی بچوں کے دلوں میں فرانس کی

محبت کا بیج بویا گیا۔ یہ بیج بڑھا اور آج ایک تناور فرنچ حکومت کے سایہ دار درخت کی صورت میں شام میں موجود ہے۔

جامعہ کی چار دیواری میں اس اہمیت پر استدلال قائم کرنے کی ضرورت نہیں جو قوموں کی تکوین و تخلیق میں زبانوں کو حاصل ہے۔ مذہب کے بعد وہ زبان ہی ہے جو پوری قوم کو ایک متحدہ قوم بناتی ہے۔ وہ زبان جو کسی قوم میں ذریعۂ تعلیم نہ ہو کبھی سرسبز نہیں ہو سکتی۔ یہی سبب ہے کہ جہاں تک نئے تعلیم یافتہ افراد کا تعلق ہے ہماری زبانوں کو بہت کم امداد ملی ہے وہ تعلیمی زبان نہ ہونے کی وجہ سے علوم و فنون کے خزانوں سے محروم ہے اور نئے علوم بدیسی زبان کے ایک ایسے پنجرے میں بند ہیں جہاں تک رسائی بے اس کے ممکن نہیں کہ پہلے ہم اس بدیسی زبان میں سالہا سال تک مہارت حاصل کر لیں پھر بھی ہمارے بچے ان علوم کی تہ تک بآسانی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک ان علوم کے سمجھنے سے پہلے وہ اس زبان کی مشکل کو حل نہ کر لیں۔ مثال یہ ہے کہ آپ ان کو الجبرا یا حساب کا کوئی مسئلہ حل کرنے کو انگریزی زبان میں سوال دیتے ہیں۔ بچے کو پہلی مشکل یہ ہے کہ وہ اس سوال کی زبان کو سمجھے، پھر علم کی مشکل کو حل کرے، پھر بھی وہ اس کو اس آسانی سے نہیں سمجھ سکتا جس آسانی سے وہ اپنی مادری زبان میں سمجھ سکتا ہے اور سمجھ لینے کے بعد بھی اس کو مادری زبان میں دہرانے پر تو یقیناً قدرت نہیں رکھتا کہ اس کے لئے ں کو پہلے مناسب الفاظ اور مصطلحات کے پیدا کرنے کی مشکل درپیش رہتی ہے۔

ہندوستان میں مسلمان نہ صرف یہ کہ مادری زبان میں علم کی تحصیل سے معذور ہیں

بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ سرے سے مادری زبان سے محروم ہیں۔ ہندوستان زبانوں کا دنگل ہے۔ صوبہ وار زبانوں کو چھوڑ کر اُردو ہندی کا ایک مستقل دنگل اس ملک میں قائم ہے ہمارے وطنی بھائیوں نے اس اہمیت کو پوری طرح محسوس کرکے جو زبان کو قوم کے وجود میں حاصل ہے یہ عزم کرلیا ہے کہ وہ ہندی کو اپنی مادری نہ سہی تو علمی و ادبی زبان تو ضرور ہی بنالیں گے۔ لیکن مسلمان اب تک اس عزم اور فیصلے سے غافل ہیں اور ابھی تک انگریزی ہی بولنے لکھنے اور پڑھنے کو کمال کا معیار جان رہے ہیں، اور دوسری قوم سے مستعار مانگی ہوئی دولت پر فخر کرنا حماقت نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اگر ہندوستان کو ایک قوم بننا ہے تو یہاں کی زبان کو بھی ایک ہندوستانی زبان بننا ہے اور یہ وہی زبان ہوگی جس کو ہندو مسلمانوں کی ملی جلی طاقت نے ایک ہزار برس کے میل جول سے اس ملک میں پیدا کیا ہے۔

اب تک ہم اس ساحرانہ فریب نظر میں پھنسے تھے کہ ان نئے علوم کی تعلیم بدیسی زبان کے سوا ہندوستان کی مادری زبان میں ہو ہی نہیں سکتی مگر یہ سحر اب ٹوٹ رہا ہے اور سرکار نظام کی بہادرانہ پیش قدمی نے اس جال کے ایک ایک تار و پود کو الگ الگ کردیا ہے اور ثابت کردیا ہے کہ یہ علوم کسی خاص زبان کے پابند نہیں۔ شراب کو جس پیالے میں بھی پیو وہ شراب ہے اور تلوار کو جس غلاف میں بھی رکھو وہ تلوار ہے۔ سوال ظرف کا نہیں مظروف کا ہے۔

مسلمانو! اٹھو اور ایک نئے تعلیمی نظام کی بنیاد رکھو۔ دنیا کا انتظار نہ کرو، وقت ہے کہ تم آگے بڑھو، دنیا خود تمھارے پیچھے آئے گی۔